

جاسوسی دنیا

9- پُر اسرار اجنبی

10- احمقوں کا چکر

11- پہاڑوں کی ملکہ



پیشرس

”پراسرار اجنبی“ اپنے اچھے ہوئے واقعات کی بناء پر ایک انتہائی دلچسپ ناول ہے۔ آپ اس میں دیکھیں گے کہ جرائم کی خاص طبقے تک محدود نہیں۔ مصلح بھی مجرم ہو سکتا ہے۔ ایک ادیب بھی مجرم کر سکتا ہے۔

مجرم وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں لوگ مصنف سمجھتے ہیں، ہمارے آپ کے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہیں سوسائٹی قطعی بے ضرر سمجھتی ہے لیکن ان کے سیاہ کارناموں پر سے پردہ اٹھتے ہی دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ ایک انتہائی چالاک عورت جس کی ایک ہی جنمیش ابرو پر بڑے بڑے مجرموں کے دل دہل جاتے ہیں۔ اپنی جنسی خواہشات کے طوفان میں گھر کر کس طرح بے بس اور مجبور ہو جاتی ہے۔

اور پھر.....

ایک خوبصورت نوجوان کی دلآویز مسکراہٹ اس کے جلال و جبروت کے ظلم کو فنا کر دیتی ہے۔ وہ عورت جس نے قاتلوں کے چھکے چھڑا رکھے ہوں..... وہ..... ایک حسین نوجوان کے قدموں میں بے دست و پا پڑی تھی۔

اور..... وہ نوجوان.....؟

فریدی اور حمید اس ناول میں کیا کر رہے ہیں؟ اس کا جواب اس ناول کے دلچسپ مطالعہ سے ملے گا۔

پبلشر

پراسرار اجنبی

دلاور پور تھا تو اچھا خاصا بڑا قصبہ، لیکن پھر بھی اس کے مغربی سرے پر ایک چھوٹی سی انگریزی طرز کی خوبصورت عمارت کا وجود واقعی تعجب انگیز تھا۔ دلاور پور ایک بہت پرانی بستی تھی۔ یہاں سے شہر تقریباً دس میل کی دوری پر تھا۔ یہاں زیادہ تر زمیندار آباد تھے، جن کے بڑے بڑے مکان جو پشت ہا پشت سے بطور میراث منتقل ہوتے چلے آئے تھے آج بھی اپنی اصلی یا کچھ شکستہ حالت میں موجود تھے۔ ان عمارتوں میں ایک انگریزی وضع کی عمارت کا وجود کچھ عجیب سا لگتا تھا اور اس میں رہنے والے مرد و زن لوگوں کی نظروں میں اس عمارت سے بھی عجیب تھے۔ یہاں سعید اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ سعید ایک خوبصورت اور خوش وضع انسان تھا۔ اس کے باپ کا شمار یہاں کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس نے سعید کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ بھیج دیا تھا جہاں وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور صنعت و حرفت میں دلچسپی لیتا رہا۔ صنعت و حرف میں اس کا خاص موضوع کاغذ بنانا تھا، تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ وہ مختلف قسم کے کاغذ بنانے کی ٹریننگ بھی لے رہا تھا۔ اس کے والد کو تو قہقہے کہ وہ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد کوئی بہت بڑی سرکاری ملازمت پا جائے گا۔ لیکن اس کی واپسی پر انہیں اپنی آرزوؤں کا خون ہوتا دکھائی دیا۔ سعید نے ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے اس نے شہر میں کاغذ بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول دیا۔ حالانکہ اس کے باپ کو یہ بات بہت

ناگوار گزری لیکن وہ اس پر اس کی مخالفت میں کچھ زور بھی نہ ڈال سکے کیونکہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور دنیا میں اس کے علاوہ ان کا تھا ہی کون۔ تیرہ اولادوں میں صرف وہی ایک بچا تھا۔ بیوی پہلے ہی مر چکی تھی اور اب خاندان میں صرف یہی دو باپ بیٹے رہ گئے تھے۔

شروع شروع میں کارخانہ اچھا خاصا چلتا رہا۔ پھر اچانک نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ ادھر سعید کا باپ بھی بیمار پڑ گیا۔ اس کی علالت کے سلسلے میں وہ کاروبار کی طرف کچھ دھیان نہ دے سکا۔ کارخانہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر ان کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی، جس دن کارخانے میں تالا پڑا اس کے دوسرے ہی دن اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ زمینداری کا سارا بار بھی اس پر آ پڑا۔ گو آدمی تھا ذہین، طبیعت نہ لگنے کے باوجود بھی اس نے کام میں بہت جلد مہارت حاصل کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی جدت پسند طبیعت نے اسے ٹھو کے دینے شروع کئے اور اس کے دل میں کاشت کاری کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ ایک ٹریکٹر خریدا گیا۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو یکجا کر کے ان کی چک بندی کی گئی۔ عمدہ عمدہ بیج حاصل کئے گئے اور پھر سعید نے باقاعدہ کھیتی باڑی شروع کر دی۔ وہ خود ٹریکٹر چلاتا۔ کھیتوں کی سینائی اور زرائی بھی خود ہی کرتا اور گاؤں والے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے۔ جس وقت وہ سوٹ پہنے منہ میں پائپ دبائے ٹریکٹر پر بیٹھ کر راستوں سے گزرتا تو لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے۔ ہم چشم آوازے کتے لیکن وہ بُرا نہ مانتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے عادی ہو گئے۔

سعید ایک بااخلاق اور سیدھا سادا آدمی تھا۔ شروع شروع میں لوگ اس کی طرف بدظن ضرور تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی شرافت اور اخلاق نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور پھر اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ ماحول سے بغاوت تھی۔ ہندوستان کی فضا میں وہ مغربی کسان کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ چیز عوام کے لئے عجوبہ تھی اور ہر عجیب چیز بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ بعض بے تکلف لوگ اسے مذاقاً کسان صاحب کہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ قصبے میں جب بھی کسی کو گفتگو کے دوران میں اس کا حوالہ دینا پڑتا تھا تو وہ اسے

کسان صاحب ہی کے نام سے یاد کرتا، اس میں طنز اور مذاق کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد سعید نے گاؤں کے مغربی سرے پر شہر سے آنے والی سڑک سے کچھ دور ہٹ کر اس انگریزی طرز کی عمارت کی بنیاد ڈالی۔ اس عمارت کے نزدیک ہی اس نے ایک بہت بڑا اناج گھر بنوایا۔ ان دونوں عمارتوں کے گرد ایک بہت لمبا چوڑا میدان تھا۔ جہاں اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بنائی گئی تھیں جن میں مرغیاں اور دودھ دینے والے جانوروں کے رکھے جانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ سڑک سے تھوڑی ہی دور پر پیال کے بنڈلوں کے ڈھیر کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ یہ دراصل اس کا کھلیان تھا۔ یہاں پودوں سے اناج الگ کرنے کے بعد ان کے بنڈل بنا کر سلیقے سے اوپر تلے چن دیئے جاتے تھے۔

اس نئے مکان کی تعمیر کے بعد سعید نے اپنے آبائی مکان کو چھوڑ دیا اور مستقل طور پر یہیں آ کر رہنے لگا۔ اس دوران میں اس نے شہر کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر لی اور اس کی بیوی بھی اتفاق سے بالکل اسی کی طرح جدت پسند واقع ہوئی تھی۔

شادی کے سلسلے میں ایک بار پھر اُسے مخالفت کے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بھلا کسی خاندانی آدمی کی شادی کسی ایسے خاندان میں ہو، گاؤں کے لوگ کس طرح پسند کر لیتے، جس کے حسب و نسب ہی کا پتہ نہ ہو اور پھر اس پرستم یہ تھا کہ سعید اپنی بیوی کو بھی بے پردہ رکھتا تھا۔

آہستہ آہستہ یہ طوفان بھی دب گیا۔ یہاں بھی سعید کی شرافت کام آئی۔ وہ بُرا بھلا کہہ جانے کے باوجود بھی لوگوں سے اسی طرح ملتا رہا۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا رہا۔ کچھ دنوں بعد اُسے بُرا بھلا کہنے والوں کی گردنیں پھر جھک گئیں۔

اب دونوں میاں بیوی نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس وقت رات کی تاریکی میں سفید عمارت کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ دبیر کا مہینہ تھا۔ سردی اپنے شباب پر تھی حالانکہ ابھی صرف آٹھ ہی بجے تھے، لیکن سارے گاؤں پر کچھ اس طرح کا سکوت طاری تھا جیسے رات گزر گئی ہو۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے یا بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی دور تک لہراتی چلی جاتیں اور پھر ان کی بازگشت سنائی دیتی۔

دفعتاً شہر سے آنے والی سڑک پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی نظر آئی۔ کار تیزی سے

میں سب سے عجیب چیز یہ تھی کہ وہ موٹا نہ ہونے کے باوجود بھی کافی بھاری بھر کم معلوم ہو رہا تھا۔
 ”میں اس بے وقت تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”لیکن آپ کا اس طرح بغیر اجازت کسی کے گھر میں گھس آنا کوئی اچھی بات نہیں۔“
 سعید نے تلی سے کہا۔

”مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔“ اجنبی بیٹھ کر ہانپتے ہوئے بولا۔
 ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”پناہ..... صرف ایک رات کے لئے۔“ اجنبی بولا۔

اتنے میں سعید کی بیوی بھی آگئی۔ وہ بھی اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن
 شاید اجنبی اس کی موجودگی سے ناواقف تھا۔ وہ سعید کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”میں آپ کو جانتا نہیں۔“ سعید نے کہا۔ ”معلوم نہیں آپ کون ہیں کیسے ہیں؟“
 ”اس وقت میرے پاس اپنی شرافت کا کوئی ثبوت نہیں۔“ اجنبی نے کہا اور پھر اپنی جیب
 سے نوٹوں کا ایک بڑا سا بنڈل نکال کر سعید کے سامنے میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں ایک
 رات آپ کی چھت کے نیچے رہنے کی یہ قیمت ادا کر سکتا ہوں۔“
 سعید کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی نوٹوں کے بنڈل کو۔
 ”کیا کوئی آپ کا تعاقب کر رہا تھا.....؟“ سعید نے پوچھا۔
 ”یہی سمجھ لیجئے۔“

”پولیس.....؟“ سعید نے سوال کیا۔

”تو کیا آپ مجھے بد معاش ہی سمجھتے ہیں؟“ اجنبی مسکرا کر بولا۔ وہ خود کو بہت زیادہ مطمئن
 اور پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کا بار بار مزمر کر برآمدے کی طرف دیکھنا اس
 کے خوفزدہ ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

سعید نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور بدستور اسے گھورتا رہا۔

”بولئے کیا کہتے ہیں آپ.....؟“ اجنبی بولا۔

”مجبوری ہے۔“ سعید نے جواب دیا۔

سڑک سے اتر کر سعید کے مکان کی طرف بڑھنے لگی اور پھر وہ پیال کے بنڈلوں کے ایک ڈھیر
 سے اس طرح نگرانی کہ اس کا اگلا حصہ اس میں دھنستا چلا گیا۔ مشین بند کر دی گئی۔ ایک بھاری
 بھر کم آدمی کار سے اترتا اور پیال کے بنڈل اٹھا اٹھا کر کار پر پھینکنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری
 گاڑی اس میں چھپ کر رہ گئی۔ اس کام سے فراغت پا کر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ دور پر
 اسے کسی دوسری کار کی روشنی دکھائی دی۔ وہ جھپٹ کر پیال کے ڈھیر کے پیچھے چلا گیا۔ وہ آہستہ
 آہستہ دوڑتا ہوا سعید کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔

آج سچر کی رات تھی، اس لئے سعید نے معمول کے مطابق سارے نوکروں کو چھٹی دے
 دی تھی تاکہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر رات بسر کریں۔ سچر کی رات کو وہ ان نوکروں کو بھی
 چھٹی دے دیا کرتا تھا جو رات وہیں بنگلے ہی میں بسر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ باورچی بھی سچر کی شام
 کو رخصت کر دیا جاتا تھا۔ اس رات کا کھانا سعید کی بیوی خود تیار کیا کرتی تھی۔ آٹھ بج رہے
 تھے، لیکن ابھی تک کھانا نہیں پک چکا تھا۔ سعید کھانے کے کمرے ہی میں اپنے حساب کتاب کے
 کاغذات اٹھالایا کرتا تھا تاکہ وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی بیوی سے غپ بھی لڑا سکے، جو باورچی خانہ میں
 روٹیاں پکا چکنے کے بعد سالن کی دیگیوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی۔

”بھئی یہ گوشت تو گلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔“ سعید کی بیوی
 نے باورچی خانے سے کہا۔

”پرواہ نہ کرو۔“ سعید نے حساب جوڑتے جوڑتے سر اٹھا کر کہا۔ ”چائے کا پانی رکھ دو تو
 بہتر ہے، سردی بہت ہے۔“

”اچھا.....!“

اور پھر برآمدے میں بھاری بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ سعید چونک پڑا۔ آواز
 لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ سعید سمجھا شاید اس کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔

دفعتاً ایک اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔ سعید کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے غصہ اور حیرت بھری
 نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ آنے والا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس نے ایک بہت عمدہ قسم کے کتھی
 سرج کا سوٹ پہنچ رکھا تھا۔ انداز سے کوئی متمول اور باوقار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت

”تو پھر میں بھی مجبور ہوں۔“ اجنبی جیب سے پستول نکال کر سعید کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
 سعید کی بیوی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اجنبی چونک کر اس کی طرف مڑا۔
 ”اوہ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں کوئی خاتون بھی تشریف رکھتی ہیں۔“ اجنبی نے کہا
 اور جلدی سے پستول جیب میں رکھ لیا۔

”خواتین کی موجودگی میں اس قسم کی حرکت غیر شریفانہ ہے۔“ اجنبی ندامت آمیز لہجے
 میں بولا۔ ”خیر اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں ہلاک کر دیا جاؤں تو میں جا رہا ہوں۔“ اجنبی اپنے
 نوٹوں کا بنڈل دبیں چھوڑ کر باہر جانے کے لئے واپس مڑا۔
 سعید عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے جاتے دیکھ کر بولا۔ ”نہریئے۔“
 اجنبی رک گیا۔

”آپ آخر بتاتے کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 ”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ اجنبی نے کہا۔ ”لیکن جو لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں وہ اچھے آدمی
 نہیں ہیں۔“

”تو آپ چاہتے کیا ہیں؟“
 ”اُن کی نگاہوں سے چھپنا۔... صاف آج رات کے لئے۔“ اجنبی بولا۔
 اتنے میں باہر موٹر کے رکنے کی آواز آئی۔
 سعید گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
 ”وہ کیا ہے.....؟“ اجنبی نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 برآمدے میں کئی قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

”کوئلے کی کوٹھری۔“ سعید نے جواب دیا۔
 قدموں کی آہٹ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔
 ”اس میں باہر جانے کا کوئی راستہ ہے؟“
 ”ایک چھوٹی سی کھڑکی جو پشت پر میدان میں کھلتی ہے۔“ سعید نے جواب دیا۔
 ”ٹھیک.....!“ اجنبی نے کہا اور دوڑ کر کوئلے کی کوٹھری میں گھس گیا۔

سعید نے نوٹوں کے بنڈل پر اپنی ہیٹ رکھ دی اور اپنی بیوی کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی
 بیٹھ کر کچھ لکھنے لگا۔
 دفعتاً پانچ آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔

جو سب سے آگے کھڑا تھا، صورت شکل کے اعتبار سے عجیب تھا۔ قد لمبا، جسم اکہرا،
 آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ناک طوطے کی چونچ سے مشابہ، پیشانی چہرے کے تناسب کے اعتبار سے
 کافی اونچی، آنکھوں کے کونے کے قریب کنپٹیوں پر شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔ پتلے پتلے بچھے
 ہوئے ہونٹوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ بقیہ چار آدمی دروازے کے قریب کھڑے ادھر ادھر دیکھ
 رہے تھے۔

سعید انہیں دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
 ”آپ لوگ کون ہیں اور بغیر اجازت یہاں کیسے گھس آئے۔“ سعید تیز آواز میں بولا۔
 ”ہمیں ایک آدمی کی تلاش ہے۔“ لمبا آدمی پرسکون لہجے میں بولا۔ اس کی تیز اور چمکیلی
 آنکھیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
 ”مگر بغیر اجازت.....!“

”مجھے اس کے لئے افسوس ہے۔“ اس نے سعید کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
 اس کی آنکھیں بدستور ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔

”اگر وہ میرے نوکروں میں سے ہے تو نہیں مل سکتا کیونکہ میں سچر کی رات کو اپنے
 نوکروں کو چھٹی دے دیتا ہوں۔“ سعید نے برا سامنے بتا کر کہا۔

”کیا یہاں ابھی کوئی آدمی آیا تھا؟“ اس نے سعید کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں..... لیکن اس طرح بغیر اجازت.....!“

”میں پھر معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا اور تھوڑی دیر خاموشی سے کھڑا رہنے کے بعد
 اپنے ساتھیوں کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔

دور تک قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر سکوت چھا گیا اور دفعتاً کار کے اشارت
 ہونے کی آواز آئی۔

سعید اور اس کی بیوی نے اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔

کوئلے کی کھڑی کا دروازہ کھلا اور وہ اجنبی ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ سعید کی بیوی نے بنگلے کے دروازے بند کر دیئے۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ باورچی خانے سے بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اجنبی نے دو چار گہرے گہرے سانس لئے اور کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے تھکن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

سعید کی بیوی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ واپسی پر اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ اس نے ایک پیالی چائے بنا کر اجنبی کی طرف بڑھادی، جو آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ آنکھوں میں احسان مندی کی جھلک تھی۔

”بیٹی! میں تم لوگوں کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ اگر آج رات کو میں بیچ گیا تو ان سبھوں کو دیکھ لوں گا۔“ اجنبی نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا تیار ہو گیا۔

تینوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا..... پھر سعید نے اسے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ زینے طے کرتے ہوئے اوپری منزل پر جا رہے تھے۔

”آپ یہاں اس کمرے میں سوئیں گے۔“ سعید نے اس سے کہا۔

”شکریہ.....!“ اجنبی بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے متعلق ابھی آپ کو کچھ نہیں بتا

سکتا۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں، میں بھی ایک ذی عزت آدمی ہوں۔“

”خیر..... خیر..... آپ آرام کیجئے۔“ سعید نے کہا۔ ”آپ اپنے نونوں کا بندل نیچے چھوڑ آئے

ہیں۔ مجھے کسی قسم کے معاوضے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے مجھے کافی دیا ہے۔“ سعید نیچے چلا آیا۔

وہ اور اس کی بیوی کافی دیر تک اجنبی اور اس کا تعاقب کرنے والوں کے متعلق گفتگو کرتے

رہے۔ سعید کی بیوی بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ ڈر تو سعید بھی رہا تھا لیکن اپنی بیوی کی تسکین کے لئے

وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے ان واقعات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

سعید باتیں کرتے کرتے دفعتاً چونک پڑا۔ اوپر چڑچڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر ایسا

معلوم ہوا جیسے کوئی وزنی چیز دھپ سے چھت پر آ رہی ہو۔

کچھ قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔ سعید اور اس کی بیوی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سعید اٹھ گیا اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کہاں.....؟“

”اوپر.....!“

”میں بھی چلوں گی۔“

”تم یہاں اکیلے ڈرو گی؟“

”نہیں یہ بات نہیں..... میں آپ کو تنہا نہ جانے دوں گی۔“

دونوں دبے پاؤں زینے طے کرنے لگے۔ اوپر سناٹا تھا۔ وہاں دونوں چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گئے اور دفعتاً اس کی بیوی چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔

سانے زمین پر ایک آدمی اونڈھا پڑا تھا اور اس کی پشت میں ایک بڑا سا چاقو پیوست تھا۔ زمین پر خون کی ایک پتلی سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ اجنبی نہیں تھا۔ یہ تو وہی تھا جو اس کا تعاقب کر رہا تھا طوطے کی چونچ جیسی ناک والا..... اور..... اجنبی غائب تھا۔ سعید کی بیوی ابھی تک اس سے لپٹی کھڑی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔ سعید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سعید اسے اٹھا کر نیچے لے آیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ نوکروں کو پہلے ہی چھٹی دے چکا تھا۔ گاؤں تقریباً تین فرلانگ کی دوری پر تھا۔ وہ بیوی کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر کہیں ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پن چکی پر رہنے والے بھکی آ رشت کو آواز دے۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کے آواز دینے پر چلا ہی آئے۔ سعید ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کے سر پر کسی نے کوئی وزنی چیز دے ماری۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور دوسرے ہی لمحے میں تین چار آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔

”اور خزانہ.....!“

”ٹھہریے۔“ گنگولی نے ایک دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس نے جیب سے کنجوں کا لچھا نکال کر دروازہ کھولا اور اندر کا بلب روشن کر دیا۔ یہاں کئی تجوریاں رکھی ہوئی تھیں اس نے ایک ایک کر کے سب تجوریاں کھولیں اور پلٹ کر تھیر آمیز نظروں سے جگدیش کی طرف دیکھنے لگا۔

”کہئے۔“

”میرے خیال سے تجوریوں کی چیزیں بھی موجود ہیں۔“

”تو اس کا یہ مطلب کہ دروازہ دھوکے سے کھلا رہ گیا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”صدر دروازے

کی کنجی کس کے پاس رہتی ہے۔“

”ایک میرے پاس اور ایک صفائی کرنے والے کے پاس۔ لیکن وہ بہت ہی معتبر آدمی ہے۔“

”کیا آج یہ دروازہ اسی نے بند کیا تھا۔“

”نہیں..... میں نے۔“ گنگولی نے کہا۔ ”لیکن صبح کو روزانہ وہی کھولتا ہے۔“

”غالباً صفائی کرنے کے لئے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

”تو آپ کو قطعی اطمینان ہے کہ کوئی چیز گئی نہیں۔“

”ٹھہریے! میری دانست میں تو سارا کیش موجود ہے۔ لیکن میں فون کر کے خزانچی کو

بلائے لیتا ہوں۔“ گنگولی نے کہا اور بڑھ کر فون کرنے لگا۔

جگدیش کھڑا سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے چینی سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”یہ صفائی کرنے والا کون ہے۔“ جگدیش نے اچانک پوچھا۔

”سلیم.....!“

”کہاں رہتا ہے۔“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ گنگولی نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

”جی.....!“ جگدیش نے حیرت سے کہا۔ ”اور آپ نے اس کے پاس چابی کیوں رہنے دی۔“

بنک میں گڑبڑ

اسی رات دلاور پور سے دس میل کی دوری پر شہر میں نیشنل بینک کی عمارت کے سامنے پولیس کی لاری کھڑی ہوئی تھی۔ پولیس انسپکٹر جگدیش بینک کے کھلے ہوئے صدر دروازے کے قریب کھڑا بینک کے منیجر مسٹر گنگولی سے باتیں کر رہا تھا۔

”تو یہ دروازہ کھلا ہوا پایا گیا۔“ انسپکٹر جگدیش نے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“ گنگولی نے جواب دیا۔

”آپ کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی؟“

”میں اوپر کی منزل میں رہتا ہوں۔“

”اوہ.....!“ جگدیش نے عمارت پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”نچلی منزل میں بینک تھا.....

اس کے اوپر ایک منزل اور تھی اور اس کے اوپر سپاٹ چھت۔

”آپ ہی نے مجھے فون کیا تھا۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”نہیں، میں آپ کو فون کرنے ہی جا رہا تھا کہ آپ پہنچ گئے۔“

”آپ کا نام.....!“

”پی ایس گنگولی۔“

”جی.....“ جگدیش نے حیرت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔“

”نہیں.....!“

”لیکن فون کرنے والے نے بھی یہی نام لیا تھا۔“

”ارے.....!“ گنگولی چونک کر بولا۔

”عجیب بات ہے۔“ جگدیش نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”چلیے۔“

وہ دونوں اور ایک کانسٹیبل بینک کے اندر داخل ہوئے۔

”وہ کافی معتبر آدمی ہے۔“

”معلوم نہیں آپ کی نظروں میں معتبر ہونے کا کیا معیار ہے۔“ جگدیش طنز یہ انداز میں بولا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت معتبر آدمی ہے۔“

”آپ تو اوپر رہے ہوں گے پھر آپ کو دروازہ کھلنے کا علم کس طرح ہوا؟“

”الارم.....!“ گنگولی نے خزانے کی بار اشارہ کیا۔ ”بنک بند کرتے وقت میں اس

میں الارم لگا دیتا ہوں جس کی گھنٹی میں نے اوپر لگا رکھی ہے۔“

”تو اس کا یہ مطلب کہ کسی نے یہاں داخل ہو کر خزانے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔“

”جی ہاں.....!“

”لیکن کھولنے میں کامیاب نہیں ہوا۔“

”یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔“ گنگولی نے پریشانی کے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ اس کا دروازہ بند

کرنے پر خود بخود دالا لگ جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کھولنے والے نے کھول کر بند بھی کیا ہو۔“

”تب تو ہمیں خزانچی کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ جگدیش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”الارم

سن کر یہاں تک آنے میں آپ کو کتنا عرصہ لگا ہوگا۔“

”تقریباً پندرہ منٹ.....!“ گنگولی نے جواب دیا۔

”پندرہ منٹ.....!“ جگدیش نے حیرت سے کہا۔ ”پندرہ منٹ تو بہت ہوتے ہیں۔

خطرے کا الارم سن کر بھی اتنی دیر کر دی آپ نے۔“

”اسکی بھی وجہ ہے۔“ گنگولی نے مسکرا کر کہا۔ ”اکثر چوہوں کی عنایت سے بھی ایسا ہو جایا کرتا

ہے اور پھر میں نے سوچا کہ سرشام چلتی ہوئی سڑکوں پر کون اس کی ہمت کر سکے گا۔ اسی خیال سے

میں ٹال گیا۔ لیکن پھر طبیعت نہ مانی اور تھوڑی دیر بعد جب میں نیچے اترا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔“

”ہوں.....!“ جگدیش نے گنگولی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

گنگولی خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شدید قسم کی بے چینی ظاہر

ہو رہی تھی۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اسی کی حرکت ہو۔“ جگدیش نے کہا۔

”میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

”مگر اس یقین کی وجہ؟“

”میں اسے عرصہ سے جانتا ہوں۔“

”اور تعجب ہے کہ آپ اس کے گھر کے پتے سے واقف نہیں۔“ جگدیش نے کہا۔

گنگولی خاموش ہو گیا۔ اس کے تئیں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق ذکر کرنا پسند

نہیں کرتا۔

تھوڑی دیر بعد خزانچی آ گیا۔ اس نے کیش دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ کام بھی ختم ہو گیا۔

”کیش پورا ہے..... کوئی کی نہیں اور دوسری چیزیں بھی موجود ہیں۔“ خزانچی نے کہا۔

”خیر..... یہ بھی اچھا ہوا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ

کے نام سے مجھے فون کس نے کیا اور اس کا مقصد کیا تھا۔“

ابھی گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ باہر شور سنائی دیا اور ساتھ ہی ایک ایسے دھماکہ کی آواز آئی

جیسے کوئی بہت وزنی چیز کافی اونچائی سے نیچے پھینکی گئی ہو۔

سارے لوگ گھبرا کر بینک سے سڑک پر نکل آئے۔

”کون ہے..... کون گرا.....!“ ایک طرف سے آواز آئی۔

مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ جگدیش بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک بے جان آدمی سڑک پر

اوندھا پڑا تھا۔

”کہاں سے گرا.....!“ جگدیش نے بے اختیارانہ انداز میں پوچھا۔

”اوپر سے.....!“ کئی آدمیوں نے بینک کی عمارت کی سپاٹ چھت کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

جگدیش کی ٹارچ کی روشنی گرنے والے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جگدیش نے نیچے

جھک کر دیکھا۔

”ختم ہو گیا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگرے یہ تو سلیم ہے۔“ دفعتاً گنگولی کی آواز سنائی دی۔

”سلیم..... کون سلیم۔“ جگدیش چونک کر بولا۔ ”وہی جو صفائی کرتا تھا۔“

”جی ہاں.....!“ گنگولی گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ”مگر یہ اس وقت یہاں کہاں۔“ گنگولی حیرت سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

”ارے یہ اوپر روشنی کیسی۔ وہ کون ہے؟“ گنگولی بے اختیار انداز میں چینا۔

چھت پر کوئی ٹارچ کی روشنی میں سر جھکائے کچھ دیکھ رہا تھا۔ گنگولی کی چیخ سنتے ہی اس نے ٹارچ بجھا دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اوپر تاریکی تھی لیکن ستاروں کی چھاؤں میں ایک دھندلا دھندلا سا بے حس و حرکت مجسمہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”خبردار..... اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔“ جگدیش نے ریو اور نکالتے ہوئے چیخ

کر کہا۔

”بہت بہتر حضور والا.....!“ اوپر سے آواز آئی۔

جگدیش آواز سن کر چونک پڑا۔ آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ لیکن اس نے سوچا شاید وہم ہوا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسا غرر آدمی ہے۔

جگدیش نے سپاہیوں کو اوپر جانے کا اشارہ کیا اور خود ریو اور نکالتے کھڑا رہا۔ سپاہی آگے

بڑھے۔

”انہیں تکلیف نہ دیجئے گا..... میں خود حاضر ہو رہا ہوں۔“ اوپر سے آواز آئی۔

”ارے.....!“ جگدیش تقریباً اچھلتے ہوئے چینا۔ ”تو کیا سچ مچ آپ ہی ہیں۔“

دوسرے لمحے میں زینے پر ٹارچ کی روشنی دکھائی دی اور ایک آدمی نیچے آیا۔

یہ محکمہ سراغ رسانی کا انسپکٹر فریدی تھا۔

جگدیش چھٹ کر اس کے قریب آیا۔

”آپ یہاں کہاں.....؟“ اس نے متوجہانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ کون ہے کچھ پتہ چلا؟“ فریدی نے جگدیش کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”سلیم..... یہاں بنک میں صفائی کرنے پر ملازم تھا۔“ جگدیش نے کہا۔

”سلیم.....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”جی ہاں.....!“

فریدی تیزی سے لاش کے قریب آیا اور جھک کر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھنے لگا۔

”تو اس کا یہ مطلب کہ اس میں گرنے سے پہلے کچھ کچھ جان باقی تھی۔“ فریدی بولا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ جگدیش نے کہا۔

”چھت پر پڑے ہوئے خون کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کافی دیر ہوئی نکلا ہے۔ کسی

نے شاید اسے زخمی کر کے اوپر ڈال دیا تھا۔ کچھ ہوش آنے پر شاید اس نے کروٹ لی اور نیچے

لڑھک آیا۔“

”ارے.....!“

”اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اسی نے فون کر کے مجھے یہاں بلایا تھا..... اور

اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہ یہاں اس بنک میں صفائی کرنے پر ملازم تھا۔“

پولیس والوں نے مجمع بٹا دیا تھا۔ جگدیش اور فریدی تباہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ اس نے خطرے سے واقف ہو کر آپ کو فون کر دیا تھا اور بعد میں مجرم

یا مجرموں کے ہاتھوں مارا گیا۔“ جگدیش نے کہا۔

”تو کیا مجرم کامیاب ہو گئے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”نہیں..... بنک میں سب کچھ جوں کا توں موجود ہے۔ غالباً ہنگامہ ہو جانے پر وہ لوگ

نکل بھاگے۔“ جگدیش نے کہا۔ ”اس نے فریدی کو شروع سے آخر تک سب حالات بتا دیئے۔“

”اور گنگولی کہتا ہے کہ اس نے تم کو فون نہیں کیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

”ہوں.....!“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”آخر اس نے یہ نہیں بتایا کہ سلیم پر اس

قدر اعتماد کی کیا وجہ تھی؟“

”جی نہیں۔“ جگدیش نے کہا۔ ”لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ اسے عرصہ سے جانتا تھا اور میرے

خیال میں اعتماد دلانے کی یہ کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی جب کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سلیم

رہتا کہاں تھا۔“

”اس قدر مالدار ہونے کے باوجود بھی اس نے ایسی ذلیل ملازمت کیوں کی تھی؟“
 ”وہ کہتا تھا کہ وہ ذاتی طور پر بینک کے کاروبار سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنے
 ناولوں میں اس کے متعلق ٹھیک ٹھیک لکھ سکے۔“
 ”اس کے متعلق تو وہ آپ سے بھی معلومات بہم پہنچا سکتا تھا۔ آخر یہاں نوکری کرنے کی
 کیا ضرورت تھی۔“

”اب میں اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ یہ بھی اس کی ایک جھک تھی۔ میرے یہاں
 ملازمت کرنے سے پہلے وہ عجائب گھر میں ملازم تھا۔“
 ”عجائب گھر میں۔“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔ ”کس عجائب گھر میں؟“
 ”پرانی یادگار کے عجائب گھر میں۔“ گنگولی نے جواب دیا۔
 ”اور وہ باوقار تنخواہ لیا کرتا تھا۔“
 ”جی ہاں۔“

”عجیب بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ خود بھی کافی مالدار تھا۔“
 ”وہ میرا دوست ضرور تھا لیکن کہنے والی بات کہنی ہی پڑتی ہے۔“ گنگولی بولا۔ ”اسے
 دولت کی ہوس تھی اور وہ ایک ایک پیسہ دانت سے پکڑتا تھا۔“
 ”اوہ.....!“

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ کیونکہ ہر شخص اپنی جگہ پر کچھ نہ کچھ سوچ ہی رہا تھا۔
 ”کیا آپ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ آخر اس کے اس وقت یہاں موجود ہونے کی کیا
 وجہ ہو سکتی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”یہی سوال تو مجھے بھی الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔“ گنگولی نے جواب دیا۔
 ”جب سے اس نے میرے یہاں ملازمت کی تھی ڈیوٹی کے وقت کے علاوہ کبھی اس
 طرف کارخ بھی نہیں کرتا تھا۔“

”میرا خیال ہے۔“ جگدیش بولا۔ ”شاید مجرم دم دلا سر دے کر اسے یہاں تک لائے اور
 اس سے یہاں کی کنجی لے کر زخمی کر کے اسے اوپر ڈال گئے۔“

فریدی مسکرانے لگا۔ جگدیش کو اس کی یہ بے موقع مسکراہٹ کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔
 ”اچھا اب لاش کو لاری پر رکھا دو۔“ فریدی نے کہا۔ ”گنگولی کہاں ہے؟“
 ”غالباً بینک میں..... آئیے چلیں۔“ جگدیش نے کہا اور کانشیلوں کو ہدایت دیتا ہوا فریدی
 کے ساتھ بینک کے اندر چلا گیا۔ خزانچی اور گنگولی اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر
 ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

فریدی اور جگدیش کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔
 ”تشریف رکھئے۔“ فریدی نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”سلیم آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ملازم تھا۔“ اس نے گنگولی سے پوچھا۔
 ”تین ماہ سے۔“

”اور اتنے قلیل عرصہ میں آپ کو اس پر اتنا اعتماد پیدا ہو گیا تھا اور آپ کو اس کے مکان کا
 پتہ بھی نہیں معلوم۔“
 گنگولی خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی ذہنی کشمکش میں
 مبتلا ہے۔

”میرا خیال ہے کہ آپ نے قریب قریب اس کے سب ناول پڑھے ہوں گے۔“ فریدی
 نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”تو آپ بھی اسے جانتے تھے۔“ گنگولی بے اختیار بولا۔
 جگدیش حیرت سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 ”آپ کی اور اس کی پرانی دوستی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔
 ”جی ہاں.....!“

”تو پھر آپ نے یہ بات جگدیش سے کیوں چھپائی تھی۔“
 ”اب جب کہ وہ مر چکا ہے مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔“
 ”تو گویا اس نے آپ کو منع کر دیا تھا کہ آپ اس کی اصلیت سے کسی کو آگاہ نہ کریں۔“
 ”جی ہاں۔“

چھپنے کی جگہ بھی نہیں۔“

”آپ نے کوئی نظریہ قائم کیا۔“

”نی الحال کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔“

”میرا خیال ہے کہ مجرموں نے سلیم سے کنبی حاصل کر کے اپنی دانت میں اسے قتل کر دیا۔“

”اور لاش بنک کی چھت پر ڈال گئے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا بچوں جیسی باتیں

کر رہے ہو۔ اگر انہیں کنبی کے لئے اسے قتل کرنا ہوتا تو اس کے لئے وہ کوئی دیرانہ منتخب کرتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب وہ بنک سے گھر واپس جا رہا تھا، اسی وقت کوئی بہلا پھسلا کر اسے چھت پر

لے گیا اور وہیں اسے زخمی کر کے اس سے کنبی حاصل کر لی تو یہ بھی کچھ ناممکن ہی سا معلوم ہوتا

ہے۔ کیونکہ اول تو اس وقت کافی دن رہا ہوگا اور وہ چھت کھلی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں ان

کے دیکھ لئے جانے کا بھی امکان رہا ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اس کے ٹیلی فون کرنے اور میرے

وہاں پہنچنے کا وقفہ بمشکل تمام بیس منٹ رہا ہوگا اور چھت پر پڑے ہوئے خون سے ظاہر ہو رہا ہے

کہ وہ ایک گھنٹہ قبل کا ہے۔“

”پھر آخر اسے کیا سمجھا جائے۔“ جگدیش نے اکتا کر کہا۔

”یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”دوسری چیز یہ بھی کم حیرت انگیز نہیں

کہ گنگولی اس سے انکار کر رہا ہے کہ اس نے تمہیں فون کیا ہے۔“

”بہر حال میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”اگر آپ اس معاملے کو الجھا

رہے ہیں تو اسے خود ہی سلجھائیے گا بھی۔“

”میں اس کیس میں خود بھی کچھ دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔“ فریدی نے جانے کے لئے

اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک اور لاش

فریدی آفس میں بیٹھا پرانے کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا کہ سرجنٹ حمید آ گیا۔

”لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت یہاں کی کنبی اپنی جیب ہی میں رکھتا رہا ہو۔“ فریدی

نے کہا۔

”لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا؟“ جگدیش نے پوچھا۔

”تم نے کبھی ٹکیل ساجد کے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔“

”جی ہاں.....!“

”یہ ٹکیل ساجد ہی تھا۔“

”ارے.....!“

”اس کا اصلی نام تو سلیم ہی تھا لیکن یہ کتابیں ٹکیل ساجد کے نام سے لکھا کرتا تھا۔“

”یہ تو بڑا مشہور مصنف تھا۔ میں نے اس کی تقریباً پچاس ساٹھ کتابیں پڑھی ہوں۔“

جگدیش بولا۔

”تو آپ کو پورا یقین ہے کہ یہاں سے کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔“ فریدی نے گنگولی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”بہتر۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے آپ کو پھر تکلیف دی جائے۔“

لاش پہلے ہی کوٹوالی روانہ کی جا چکی تھی۔ فریدی اور جگدیش بھی واپس آ گئے۔ دونوں اس

وقت کوٹوالی کے ایک کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”تو آپ چھت پر کیسے پہنچ گئے تھے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”سلیم نے مجھ سے فون پر استدعا کی تھی کہ میں جلد سے جلد بنک پہنچ جاؤں، اس کے

انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت پریشان ہے۔ لہذا میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ وہ چھت

سے نیچے آ رہا۔ میں بغیر یہ معلوم کئے ہی کہ وہ کون ہے چھت کی طرف لپکا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا

کئی جگہ خون کے دھبے جیسے دکھائی دے رہے تھے، جن کی سرخی کچھ کچھ سیاہی میں تبدیل ہو چکی

تھی اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے حادثہ پیش آئے ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔“

”شاید کسی نے اوپر سے اسے پھینک دیا ہو۔“ جگدیش بولا۔

”ناممکن۔“ فریدی نے کہا۔ ”اتنی جلدی وہاں سے نیچے آ جانا ممکن ہی نہیں اور وہاں کوئی

”آؤ چلیں۔“

”بس مجھے معاف ہی رکھئے۔“

”کبھی دلاور پور گئے ہو.....؟“

”نہیں!“

”اسی لئے ایسا کہہ رہے ہو۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”خیر میں تمہیں لے جانا مناسب بھی نہیں سمجھتا۔“

”کچھ کہئے گا بھی یا یونہی پیلیاں بھجاتے رہئے گا۔“

”ارے چھوڑو بھی..... جا کر اپنا کام کرو۔“ فریدی اکتائے ہوئے لہجہ میں بولا اور اٹھ کر

دروازے کی طرف چلنے لگا۔

فریدی کا اشارت کرنے جا ہی رہا تھا کہ حمید بھی آ کر بیٹھ گیا۔

”بہر حال تم نہیں مانو گے۔“ فریدی نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار اشارت کر دی۔

کو تو الی میں جگدیش اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”کہو بھی کیا معاملہ ہے؟“ فریدی نے جگدیش سے پوچھا۔

”ارے صاحب ایک معاملہ صاف نہیں ہوا تھا کہ دوسرا پیدا ہو گیا۔“ جگدیش نے کہا۔

”دلاور پور کے سعید کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔“

”وہی انگلینڈ ریٹرن کسان.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“ جگدیش نے کہا۔ ”دلاور نگر چوکی کے چوکیدار نے اطلاع دی ہے کہ

سعید کے گھر میں ایک لاش ملی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی غائب ہیں۔ آج صبح جب گھر

نوکر آئے تو انہوں نے گھر کھلا ہوا پایا۔ وہ دونوں غائب تھے اور چھت پر ایک لاش ملی۔“

”کھلی چھت پر.....؟“ فریدی نے استغہامیہ لہجہ میں پوچھا۔

”نہیں..... شاید اوپری منزل کے ایک کمرے میں۔“

”عالمًا مکان پر وہاں کی چوکی کے ہیڈ کانسٹیبل نے پہرہ لگوا دیا ہوگا۔“

”آج طبیعت کچھ بیزاری ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....؟“ فریدی نے بدستور سر جھکائے ہوئے پوچھا۔

”بیکاری..... دن بھر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو۔“

”تو یہ کون سی خاص بات ہے۔ تم ایک ہاتھ سر پر اور دوسرا کمر پر رکھے کھڑے رہا کرو

فریدی مسکرا کر بولا۔

حمید جھینپ گیا

”گھبراؤ نہیں..... میں نے کام ڈھونڈ لیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہی بنک والا معاملہ.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”آپ بھی خواہ مخواہ در دوسری مول لیتے پھرتے ہیں۔“

”عجیب آدمی ہو..... ابھی بیکاری سے اکتا رہے تھے اور جو کام بتایا تو جان نکل گئی۔“

”میرا مطلب کچھ اور تھا۔“

”اور تو کیا شہناز آج کل یہاں موجود نہیں.....؟“ فریدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حمید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تب تو خدا تمہیں غریق رحمت کرے۔“ فریدی نے کہا اور پھر کاغذات الٹنے پلٹنے لگا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فریدی نے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو..... کون جگدیش..... ہاں ہاں فرصت ہی ہے..... ایک اور لاش؟ کہاں.....“

دلاور پور..... اچھا..... ہاں..... وہ لوگ غائب ہیں..... نہیں..... نہیں..... فرصت

ہے..... میں ابھی آیا۔“

”لیجئے جناب حمید صاحب۔“ فریدی نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک کام اور دستیاب ہو گیا۔“

”جی ہاں..... ایک اور لاش..... سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں لاشوں کی پیداوار کیا

بڑھتی جا رہی ہے۔“ حمید بیزاری سے بولا۔

”جی ہاں.....!“

”ٹھیک.....!“ فریدی نے کہا۔ ”تو اب کیا ارادہ ہے۔“

”آپ ہی کے انتظار میں رکھا ہوا تھا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”میں آپ کو بہت تکلیف دیتا ہوں۔“

”خیر تکلفات کی ضرورت نہیں۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ چلیں۔“

فریدی حمید اور جگدیش کار میں بیٹھ کر دلاور پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

سعید کے مکان کے سامنے پہرہ لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ کھلیان سے گزرتے ہوئے مکان کے

اندرا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دلاور پور کی چوکی کا ہیڈ کانسیبل بھی تھا۔

”لاش کہاں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”میرے ساتھ آئیے۔“ ہیڈ کانسیبل زینے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

اوپر کمرے میں پہنچ کر فریدی نے سگار سلگایا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے اس

کمرے میں اس لاش کی موجودگی اس کی نظروں میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ اس نے مکان کی

پشت پر کھٹنے والی کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا، جو اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی۔

”تم جب یہاں داخل ہوئے تو یہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔“ فریدی نے ہیڈ کانسیبل سے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

اب فریدی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی پشت میں ابھی تک چاقو لگا ہوا تھا۔ فریدی نے

جیب سے محدب شیشہ نکالا اور چاقو کے دسے کا جائزہ لینے لگا۔

”انگلیوں کے نشانات تھے تو ضرور۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد سراٹھا کر کہا۔ ”لیکن کسی

نے انہیں صاف کر دیا۔ کہیں اب بھی ایک آدھ نشان موجود ہے مگر مکمل نہیں۔“

پھر وہ ہیڈ کانسیبل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کسی نے لاش کو چھوا تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”یہ تم لیے لہر سکتے ہو؟“ فریدی نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہارے پہنچنے سے قبل ہی کسی نوکر

نے اسے چھوا ہو۔“

”نوکروں کا تو یہی بیان ہے کہ کسی نے اس کمرے میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے پھر جھک کر لاش کا جائزہ لینا شروع کیا۔

”قتل یہاں اس کمرے میں نہیں ہوا۔“ فریدی نے سراٹھا کر کہا۔

”پھر.....؟“ جگدیش نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میں نہیں بتا سکتا..... لیکن قتل اس کمرے میں نہیں ہوا۔“

”آؤ خریکیے؟“

”یہاں پر سب سے پہلے خون کی مقدار.....!“ فریدی پر سکون لہجے میں بولا۔ ”اتنا کم خون۔“

حمید اور جگدیش سوچ میں پڑ گئے۔

فریدی لاش کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ وہ باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مکان کے پیچھے چھوٹا سامیان تھا اور اس کے بعد بنی زمین ڈھلوان ہو گئی تھی۔

”کیا یہ کوئی ندی ہے.....؟“ فریدی نے ہیڈ کانسیبل سے پوچھا۔

”جی ہاں..... دریاے گھاگھرا کی ایک شاخ۔“

”یہاں سے کتنا فاصلہ ہوگا.....؟“

”تقریباً ایک فرلانگ.....!“

”لیکن یہاں سے پانی نہیں دکھائی دیتا۔“

”یہ جگہ کافی اونچائی پر ہے۔“

”اوہ.....!“ فریدی نے نیچے جھک کر کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ جگدیش نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... آؤ نیچے چلیں۔“ اس نے ہیڈ کانسیبل کی طرف اشارہ کر کہا۔ ”اور ہاں وہ

سامنے چھوٹی سی عمارت کیسی ہے؟“

”پن چکی ہے..... کبھی چلتی تھی۔ تقریباً ایک سال سے بند پڑی ہے۔“

”تو وہ عمارت خالی ہے۔“

”جی نہیں..... وہاں ایک پاگل سا آدمی رہتا ہے۔ خود کو آرٹسٹ کہتا ہے اکثر تصویریں بنا

کر بکنے کے لئے شہر بھیتا رہتا ہے۔“

”ایک بستر صاف ہے اور دوسرے پر شکلیں۔“ فریدی نے جھک کر پرشکن آلود بستر پر کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”غالباً سینڈل کے تلے کا نشان ہے۔ سعید کی بیوی بڑی بدتمیز تھی کہ ایسے شفاف بستر پر سینڈل سمیت چڑھ جاتی تھی۔ مگر دوسرا نشان نہیں ہے۔ سینڈل کے ساتھ ہی ساتھ دوسرا نشان بھی غائب ہو گیا۔ نشان داہنے سینڈل کا ہے اور داہنے پیر کا سینڈل بھی یہاں نہیں ہے کیوں جگدیش صاحب..... کیا یہ دلچسپ بات نہیں۔“

”صاحب مجھے تو ابھی تک ہر چیز دلچسپ ہی نظر آ رہی ہے۔“ جگدیش بولا۔
”اتنے میں حمید آ گیا۔ سینڈل اس کے ہاتھ میں تھا۔“

”سینڈل تو نہیں ملا..... لیکن ایک دلچسپ چیز ملاحظہ ہو۔“ حمید نے سو سو روپے کے دو نوٹ فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”یہ کیا.....؟“

”لاش والے کمرے میں سینڈل تلاش کرنے کے لئے میں نے صوفہ ہٹایا تھا، اس کے پیچھے مجھے یہ دو نوٹ پڑے ہوئے ملے۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے نوٹوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بالکل نئے ہیں، یہاں تک کہ ایک آدھ بار موڑے بھی نہیں گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بنڈل میں سے سرک کر نکل گئے ہوں۔“ پھر اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”کیا سعید کوئی لاپرواہ آدمی تھا؟“

”قطعی نہیں..... میں نے اس جیسا با اصول آدمی آج تک دیکھا ہی نہیں۔ شاید وہ پائی پائی کا حساب رکھتا تھا۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

”اوپر کوئی تجوری بھی نہیں..... کوئی صندوق بھی نہیں نظر آیا اور شاید اس بڑے صوفے کی طرف کپڑے وغیرہ لٹکانے کے لئے کھوٹیاں بھی نہیں ہیں کہ یہ خیال کیا جائے کہ کپڑے لٹکاتے وقت شاید جیب سے گر گئے ہوں۔“ فریدی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔

”کل رات بینک میں کوئی گھسا..... کل رات ہی کو یہاں بھی ایک واردات ہوئی اور یہ نئے نوٹ۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”ہوں.....!“ فریدی نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

سب لوگ نیچے اتر آئے۔ فریدی ایک ایک کمرے کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا۔

”یہ شاید ان دونوں کے سونے کا کمرہ ہے۔“ فریدی نے کہا۔ اس کی تیز نظریں کونے کونے میں پہنچ رہی تھیں۔

”یہ دیوار پر خون کی چھینٹیں کیسی؟“ دفعتاً فریدی چونک کر بولا۔

”اوہ.....!“ جگدیش دیوار کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تو کیا..... تو کیا..... اسے یہیں قتل کیا گیا۔“

”لیکن یہاں قتل کر کے اوپر لے جانے کا کیا مطلب.....؟“

”بہت ممکن ہے کہ انہوں نے اسے یہیں قتل کیا ہو اور تاک میں رہے ہوں کہ موقع پا کر لاش کو کہیں ٹھکانے لگا دیں۔“ جگدیش بولا اور پھر کسی وجہ سے انہیں اس کا موقع نہ مل سکا ہو بہت ممکن ہے کہ کوئی ملنے والا آ گیا ہو اور انہوں نے جلد ہی لاش کو اوپر پہنچا دیا ہو اور پھر اے وہاں سے اتار کر ادھر ادھر نہ کر سکنے کی بناء پر صبح ہو جانے کے خوف سے فرار ہو گئے ہیں۔“

”اور اتنی دیر تک وہ اس کے زخم میں برتن لگا کر اس میں اس کا خون اکٹھا کرتے رہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”کیا فضول بکتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو یہاں فرش پر بھی خون کا ایک آدھ دھبہ ہونا چاہئے تھا۔“ فریدی اسے گھورنے لگا۔

”یہ سینڈل غالباً سعید کی بیوی کی ہے۔“ فریدی نے ایک سینڈل کی طرف اشارہ کر کے ہوئے کہا۔ ”لیکن دوسرا کیا ہوا۔“

”میں ابھی تلاش کرتا ہوں۔“ حمید نے بڑی مستعدی کے ساتھ کہا اور سینڈل اٹھا کرے کے باہر جانے لگا۔

”ارے تم اسے کہاں لئے جا رہے ہو۔“

”جوڑ ملانے کے لئے..... ممکن ہے دوسرا ڈھونڈ لاؤں۔“ حمید نے کہا اور چلا گیا۔

”عجیب لوغڑا ہے۔“ فریدی نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”سیرھی یہاں منگواؤ۔“ فریدی نے کہا۔
ہیڈ کانسٹیبل دوڑ کر سیرھی اٹھالایا۔

”اسے دیوار سے لگا دو۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اب جگہ لیش تم اس پر چڑھو۔ ہاں ٹھیک
اب اتر آؤ۔۔۔۔۔ دیکھو یہ نشانات اتنے گہرے نہیں ہیں۔ اب تم اگر حمید کو اپنے کاندھے پر لا کر
چڑھ سکتے ہو تو صرف دو تین ڈنڈوں تک چڑھنے کی کوشش کرو۔“

حمید ہنسنے لگا۔ جگہ لیش بھی کچھ مسکرایا لیکن فریدی کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر دونوں
سنجیدہ ہو گئے۔ جگہ لیش نے حمید کو کاندھے پر لا کر سیرھی پر چڑھنا شروع کیا۔

”ٹھیک ٹھیک، بس اب نیچے اتر آؤ۔ دیکھو سنجل کر۔۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔۔۔۔۔ میں سیرھی سنبھالے
ہوئے ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک۔۔۔۔۔ اب ان نشانات کو دیکھو۔۔۔۔۔ قریب قریب یہ نشانات اتنے ہی گہرے
ہیں جتنے کہ کھڑکی کے نیچے والے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ حمید نے چونک کر کہا۔

”تم ہمیشہ گدھے ہی رہو گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ لاش اسی طرف سے اوپر
لے جانی گئی۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔ خون سونے کے کمرے میں کیا گیا جیسا کہ وہاں کی دیوار پر پڑی ہوئی
چھینٹوں سے ظاہر ہے اور اسی طرف کے زینے سے اوپر لے جانے کے بجائے اس نے اتنا چکر
لگایا اور بانس کی سیرھی لگا کر لاش کو اس طرف سے اوپر لے گیا۔ گویا اچھا خاصا احق تھا۔“

”جی نہیں۔“ فریدی طنزیہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس سے بھی زیادہ احق تھا کیونکہ لاش کو
قریب کے دریا میں پھینک دینے کے بجائے اوپر لے جا کر بحفاظت رکھ دیا اور خود بیوی سمیت
دعوت کھانے چلا گیا اس نے ایسا اس لئے کیا کہ اس کی عدم موجودگی میں پولیس والوں کو زیادہ
پریشان نہ ہونا پڑے۔“

جگہ لیش ہنسنے لگا اور حمید نے جھینپ کر بغلیں جھانکنے شروع کر دیں۔

”میرا خیال ہے کہ سونے کے کمرے میں خود انہیں کوئی حادثہ پیش آیا۔ ایک سینڈل کا
نثار ہونا اسی شے کی طرف لے جاتا ہے۔“

”چلے آگئی شامت۔۔۔۔۔ نیشنل بینک اور سعید منزل الجھ گئے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔
فریدی اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔

جگہ لیش خاموش ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کمرے سے نکل آئے۔ فریدی پھر سوچ میں ڈوب گیا۔
سب لوگ مکان سے نکل کر پچھواڑے کی طرف جا رہے تھے۔
فریدی عین کھڑکی کے نیچے رک کر زمین کی طرف دیکھنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی
نگاہیں دیوار کی طرف اٹھنے لگیں۔ دفعتاً وہ مسکراتا ہوا جگہ لیش وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔

”اب ہمیں یہیں کہیں بانس کی ایک سیرھی تلاش کرنی چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ فریدی آگے بڑھ کر میدان میں چاروں طرف نظریں
دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً ایک طرف چلنے لگا اور پھر کانٹے دار جھاڑیوں کی قطار کے قریب جا کر رک گیا۔
چند لمحوں کے بعد اس نے حمید کو آواز دی۔

سب لوگ تیزی سے اس کے قریب پہنچے۔

”لو وہ سیرھی بھی مل گئی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

جھاڑیاں ہٹا کر سیرھی نکالی گئی۔ سیرھی پر کئی جگہ خون کی چھینٹیں تھیں سب لوگ استغفار
انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگے۔

”سارا کام بہت جلدی میں کیا گیا۔“ فریدی بولا۔ ”سیرھی یہاں تک لانے والا تو اتنا
بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ سیرھی کا ایک پایہ زمین پر گھسٹا ہوا جا رہا ہے۔ اگر
اس پائے کے بنائے ہوئے نشان میری رہبری نہ کرتے تو ذہن اتنی جلدی ان جھاڑیوں کے
قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔“

”اور سیرھی کا خیال آپ کو آیا کیسے؟“ حمید نے پوچھا۔

”ٹھیک کھڑکی کے نیچے زمین پر دو عدد گول اور گہرے نشانات دیکھ کر۔۔۔۔۔“ فریدی نے
کھڑکی کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔ ”اور دیوار پر کھڑکی کے قریب خون کی چھینٹیں بھی ہیں۔
دیکھو یہ رہے سیرھی کے نشانات۔ یہاں زمین کافی سخت ہے اور نشانات خاصے گہرے ہیں۔“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ جگہ لیش نے کہا۔

”چھ سات ماہ قبل کی بات ہے تم نے مجھے اخبار میں ایک مضحکہ خیز تصویر دکھائی تھی..... یاد کرو..... طوطے کی چونچ جیسی ناک..... اور تم نے اس کے ماتھے پر پھٹی کسی تھی..... چھپر کھٹ..... کہو یاد آیا۔“

”اوہ.....!“ حمید تقریباً اچھل کر بولا۔ ”وہی..... خدا کی قسم بالکل وہی ہے۔“

”اس کا نام یاد ہے۔“

”نہیں..... نام تو نہیں یاد۔“

”یہ تو یاد ہی ہوگا کہ تصویر کس سلسلے میں چھپی تھی۔“

”شاید کوئی مقدمہ تھا۔“

”ٹھیک.....!“ فریدی نے پوچھا۔ ”مقدمے کی تفصیلات یاد ہیں؟“

”نہیں.....!“

”ہاں بھی سنو جگدیش۔“ فریدی بولا۔ ”مقتول کا نام صفدر مرزا ہے۔ کنور شمشیر بہادر مرحوم کا چچا زاد بھائی۔ تم نے یہ بھی سنا ہوگا کہ پچھلے سال کنور شمشیر بہادر رنگون میں مچھلیوں کا شکار کھیلتے وقت دریا میں ڈوب گئے تھے اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔“

”وہی کنور شمشیر بہادر تو نہیں، شہر میں جن کی خویلی کا شائبہ شمشیر کے نام سے مشہور ہے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”بالکل وہی۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور جس کے لئے شاید یہ بھی مشہور ہے کہ وہاں اب بھوتوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ ہاں تو یہ شمشیر مرزا قریب قریب بالکل دیوالے ہو کر رنگون چلے گئے تھے۔ وہاں ان کو یہ حادثہ پیش آیا۔ پھر رنگون ہی سے ان کے ایک وارث اور ان کی جائیداد کے دعویدار نمودار ہوئے۔ وہ بھی صفدر ہیں لیکن جب بیچارے کو یہ معلوم ہوا کہ شمشیر بہادر کے پاس اس خویلی کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ گیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا اور پھر اس کے بعد سے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سنا گیا اور اب معلوم نہیں کس نے اسے بھی مار ڈالا۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ جگدیش وغیرہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”اب بھلا بتائیے۔“ جگدیش بولا۔ ”اگر میں آپ کو ساتھ نہ لاتا تو یہ ساری باتیں کیسے

”اور لاش.....؟“ حمید جلدی سے بولا۔

”کسی دوسرے نے پھنسانے کے لئے یہاں رکھ دی۔“ فریدی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ جگدیش پریشانی کے لہجے میں بولا۔

”سعید اور اس کی بیوی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دو۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن آپ تو انہیں بے گناہ ثابت کر رہے ہیں۔“

”اگر تمہیں میرے مشورے کی ضرورت ہے تو جو میں کہوں وہ کرو..... بقیہ معاملات مجھ پر

چھوڑ دو۔“ فریدی نے کہا۔

”بہت بہتر.....!“ جگدیش نے کہا۔

”خیر یہ مسئلہ تو طے ہوا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اب یہ دیکھنا ہے کہ مقتول ہے کون؟“

”اور یہی مسئلہ سب سے ٹیزھا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ٹیزھا کیوں..... کیا تم اسے نہیں پہچانتے؟“ فریدی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی ہاں..... میں تو اس کی سات پشت کو پہچانتا ہوں۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”نہیں..... مذاق نہیں..... تم ابھی اسے پہچان لو گے۔“ فریدی پھر مکان کی طرف بڑھتے

ہوئے بولا۔

یہ لوگ پھر لاش والے کمرے میں لوٹ آئے۔ فریدی نے مقتول کی پشت سے چاقو کھینچ

کر اسے سیدھا کیا۔

”دیکھو غور سے دیکھو..... کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”کمال کیا آپ نے۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔ ”کیوں آپ پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”تو تم اسے نہیں پہچانتے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں پہچانتا.....!“ حمید نے کہا۔ ”ویسے کچھ کچھ خیال پڑتا ہے کہ کہیں اسے دیکھا

ضرور ہے۔“

”ٹھیک.....!“ فریدی بولا۔ ”میں یہی جانا چاہتا تھا۔“

حمید اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

معلوم ہوتی۔“

”لیکن ایک چیز ہمیشہ مجھے متحیر کرتی رہی۔“ فریدی جگدیش کی بات کو نظر انداز کر ہوئے بولا۔ ”رنگوں میں شمشیر بہادر ڈوب کر مرے اور رنگوں ہی سے صندرمز ان کا وارث کر آیا..... جب کہ وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ ان کا کوئی وارث ہی نہیں۔“

خطبی مصور

تین بجے کے قریب جگدیش لاش کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ فریدی اور حمید تحقیقات کے لئے وہیں رک گئے۔

”مجھے یہ دونوں نوٹ بہت زیادہ الجھن میں ڈالے ہوئے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”آخر آپ بک والے معاملہ کو اس واقعہ سے الجھانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”میں نے ابھی تک یہ تو نہیں کہا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہے۔“

”آپ کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

”تو پھر ممکن ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعلق پیدا ہی ہو جائے۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔

”خدا وہ وقت نہ لائے تو بہتر ہے۔“

”کیوں.....؟“ فریدی نے حمید کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں خواہ مخواہ دوڑ دھوپ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔“

”پھر کیوں دوڑے چلے آئے۔“

”اپنی شرافت کا ثبوت دینے کیلئے۔“ حمید نے کہا۔ ”مگر افسوس مجھے اس کا موقع نہ ملا۔“

فریدی بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اچھا بے وقوف بنا کر لے آیا۔“ حمید نے جھنجھکی ہوئی سی بات کہی۔

”حالانکہ یہ غلط ہے۔ میں خود ہی آنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے عرصے سے کوئی باقاعدہ قاتل نہیں دیکھا تھا۔“

”تب تو بڑا اچھا ہوا کہ تمہیں شرافت دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ تمہیں اس کا بااثر

تجربہ ہو جاتا۔“

حمید اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا۔ دن بھر کی محنت کی وجہ سے اس کا دل ہی بولنے کو نہ چاہتا تھا۔ فریدی اور وہ قصبے کے اندر آئے اور تفتیش کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن سعید کے عادات و اطوار کے متعلق معلومات کے علاوہ کوئی اور کام کی بات نہ معلوم ہو سکی۔

”معاملہ کافی الجھا ہوا ہے۔“ فریدی نے قصبے سے لوٹتے وقت کہا۔

”ہوں.....!“ حمید نے بے دلی سے جواب دیا۔

”اوہ.....!“ فریدی دفعتاً چونک کر بولا۔ ”پن چکی تو رہ ہی گئی۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ دونوں پن چکی کے دروازے پر آ کر رک گئے، جو اندر سے بند تھا۔

فریدی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ ملا..... وہ بدستور دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔

”بھاگ جاؤ.....!“ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ”اس وقت یہاں جنوں کے بادشاہ

استدوس اعظم تشریف فرما ہیں۔“

”دروازہ کھولو.....!“ فریدی تند لہجے میں بولا۔

”خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ چلے جاؤ۔“ اندر سے آواز آئی۔

”دروازہ کھول دو..... ورنہ توڑ دیا جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”توڑ دیا جائے گا.....؟“ اندر سے آواز آئی۔ ”دیکھ لوں گا۔“

”ہم پولیس کے آدمی ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا.....!“ اندر سے آواز آئی۔ ”بڑی خوشی ہوئی تم لوگوں سے مل کر..... لیکن میں

دروازہ نہیں کھول سکتا۔“

”توڑ دو دروازہ.....!“ فریدی نے حمید سے حکمانہ لہجے میں کہا۔ حمید نے دروازے پر

دو تین لاتیں رسید کیں۔

”اے اے اے۔“ اندر سے آواز آئی۔

حمید اور تیزی سے دروازے کو ہلانے لگا۔

”ارے ارے..... یہ کیا کر رہے ہو بھائی۔“ اندر سے پھر آواز آئی۔

”دروازہ توڑ رہے ہیں۔“ حمید بولا۔

”اچھا ٹھہرو..... کھولتا ہوں۔“

دروازہ کھل گیا۔ ایک میلا پکیلا آدمی اندر کھڑا دونوں کو گھور رہا تھا۔

وہ مضبوط ہاتھ پیر کا ضرور تھا، لیکن انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ حد درجہ کاہل واقع ہوا ہے اس کی آنکھوں سے عجیب قسم کا وحشتانہ پن ظاہر ہو رہا تھا۔

”آخر تم دونوں مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔ مگر تم اس قصبے کے نہیں معلوم ہوتے۔“ اس نے کہا۔

فریدی اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا اندر گھس گیا۔

”ارے ارے یہ کیا۔“ اس نے احتجاجاً کہا۔

”بکومت.....!“ فریدی بولا اور تجسسانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

یہ ایک کافی لمبا چوڑا کمرہ تھا..... ایک طرف ایک پرانی چکی نصب تھی۔ دو ایک ٹوٹے پھوٹے صندوق، ایک میلی سا صراحی، ایک انگلیٹھی اور کچھ برتن ایک کونے میں کچھ برش رنگوں کے ڈبے اور ایک ایزل پڑے ہوئے تھے۔ پشت پر دریا کی جانب ایک کھڑکی تھی جس میں سلاخیں نہیں تھیں۔

فریدی اس آدمی کی طرف متوجہ ہوا، جو تھیر اور قہر آلود نگاہوں سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

”تم یہاں تنہا رہتے ہو.....؟“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”نہیں..... میرے ساتھ جنوں کی شہزادی بھی رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کوئی آدمی بھی رہتا ہے؟“

”نہیں..... لیکن تم مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ

چلے جاؤ..... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”تم کیا کام کرتے ہو.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”جنگ مارتا ہوں..... تم سے مطلب.....؟“ اس نے اس انداز میں کہا کہ حمید کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

فریدی بدستور سنجیدہ تھا۔

”جنگ مارنے کی رفتار کیا ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

فریدی نے اسے گھور کر دیکھا۔ حمید سنجیدہ ہو گیا۔

”سنو..... تم بہت اچھے آرٹسٹ ہو۔“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ”میں تم سے ایک تصویر بنوانا چاہتا ہوں..... معقول معاوضہ دوں گا۔“

”مجھے فرصت نہیں۔“ اس نے برا سمانہ بنا کر کہا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ہر بڑا آدمی یہی کہتا ہے۔“

”نہیں نہیں، سچ کہتا ہوں۔“ اس نے کچھ ملائم پڑتے ہوئے کہا۔

”چلو بھی یار سچ کہتا ہوں..... خوش کر دوں گا۔“ فریدی نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”تو تم بتا رہے ہو میرے لئے تصویر۔“ فریدی نے پھر کہا۔

”کیا بنواؤ گے.....؟“

”ایک عورت کی تصویر جو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایک سگریٹ ہوگی تمہارے پاس۔“

”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

”بالکل نہیں.....؟“

”نہیں مجھے منہ سے دھواں نکالنا پسند نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور نہ میں اپنے قریب کسی آدمی کا وجود برداشت کر سکتا ہوں۔“

”کل رات یہاں کون آیا تھا۔“ فریدی نے اچانک پوچھا۔

وہ چونک پڑا لیکن دوسرے ہی لمحے میں مسکرانے لگا۔

”پریمیاں آئی تھیں..... وہ رات بھر لوریاں دے دے کر مجھے سلاتی رہتی ہیں۔“

”میں پوچھتا ہوں کل رات کو یہاں کون آیا تھا۔“ فریدی نے تھکمانہ لہجے میں پوچھا۔
”میں بتا تو رہا ہوں۔“

اچانک فریدی نے اسے اس زور کا چائٹا رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا گیا۔
”کون آیا تھا..... یہاں کل رات کو۔“ فریدی پھر گر جا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”کون آیا تھا۔“ فریدی مکاتانتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔
”بتاتا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

فریدی نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لئے اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”اس نے مجھے دس روپے دیئے تھے۔“ اس نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر فریدی کو دکھاتے ہوئے کہا۔
”وہ کون تھا.....؟“

”یہ میں نہیں جانتا..... اس نے یہاں ایک رات بسر کرنے کے لئے مجھے دس روپے دیئے تھے۔“

”اس کے ساتھ کے دوسرے آدمیوں نے کہاں رات گزاری تھی۔“

”اس کے ساتھ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔“

”اس کا نام پوچھا تھا تم نے۔“

”اس نے نہیں بتایا۔“

”اس سے پہلے تم نے اسے کہاں دیکھا تھا۔“

”کہیں نہیں۔“

”وہ کیا تھا۔“

”ادھیڑ عمر کا ایک بھاری بھر کم آدمی۔“

”کیا بہت موٹا تھا۔“

”بالکل نہیں..... وہ موٹا نہیں تھا..... پھر بھی بھاری بھر کم معلوم ہو رہا تھا۔“
”کیا کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔“

”ہاں.....!“

”تو اس نے رات یہیں گزاری تھی۔“

”نہیں تھوڑی دیر بعد وہ چلا گیا تھا۔“

”تو پھر اس نے تمہیں دس روپے کس بات کے دیئے تھے۔“

”اس لئے کہ کم از کم رات بھر میں اپنا منہ بند رکھوں۔“

”یعنی.....؟“

”رات بھر اس کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہوں۔“

”اوہ.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”سعد کے متعلق تم نے سنا۔“

”ہاں.....!“ اس نے جواب دیا اور اس کے چہرے سے اشتعال ظاہر ہونے لگا۔

”تمہارے اس کے تعلقات کیسے تھے۔“

”میں امیر آدمیوں سے کسی قسم کا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا۔“

”کیا وہ ایسا آدمی تھا کہ کسی کو قتل کر دے۔“

”میں اس کے متعلق بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”تمہارا ذریعہ معاش۔“

”مصور۔“

”بسر اوقات مشکل سے ہوتی ہوگی۔“

”یہ میرا نجی معاملہ ہے۔“

”کل رات تم نے یہاں قریب ہی کوئی چیخ سنی تھی۔“

”نہیں.....!“

”اچھا یہ لو دس روپے تصویر بنا دینا کسی دن آکر لے جاؤں گا۔ بقیہ بیس روپے پھر دوں گا۔“

فریدی نے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دونوں باہر چلے گئے۔

”اس خبیلی مصور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”آدی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا آپ کو اس کی کہانی پر یقین آ گیا ہے۔“

”اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”آپ تو سگریٹ پیتے نہیں پھر آپ نے اس سے سگریٹ کیوں مانگا تھا۔“

”محض یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ سگریٹ پیتا ہے یا نہیں۔“

”اسے معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”یہ معلوم کئے بغیر میں یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا کہ اسکے یہاں رات کوئی آیا تھا یا نہیں

حمید اس طرح ہنسنے لگا جیسے فریدی نے کوئی بہت ہی بے تکلی بات کہہ دی ہو۔

”اس طرح مت ہنسو پیارے..... میں نے وہاں ”کاروان اے“ سگریٹ کے ڈز

جلے ہوئے ٹکڑے دیکھے تھے۔ میرے خیال سے اس قصبہ میں تو کوئی اس سگریٹ سے شوق

ہوگا۔“ حمید سنجیدہ ہو گیا۔

”حد ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اتنی سی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں۔“

بھوت

سعید کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک تاریک کمرے میں پایا جس کی ساری کھڑکیاں

دروازے بند تھے۔ سر کے پچھلے حصے میں کچھ ایسی تکلیف محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی دہان

تھوڑے مار رہا ہو۔ اس کا ہاتھ بے اختیار سر پر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سر پر پٹی بندھی

ہے۔ دفعتاً اسے سارے واقعات یاد آ گئے۔ اس کے سر پر کوئی وزنی چیز گری تھی۔ وہ لاش

پیوی کی بے ہوشی، آخر وہ ہے کہاں، اس نے لیٹے ہی لیٹے ادھر ادھر ہاتھ چلائے۔ وہ ایک نغمین
فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کی۔ داہنی کبھی زمین پر ٹیک کر اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ اسے
دور قدموں کی آہٹ سنائی دی، جو لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اسی کمرے کا ایک دروازہ
کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ تاریکی میں ایک متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ سعید کے قریب آ کر
رک گیا۔

”کیا تمہیں ہوش آ گیا تھا۔“ ایک آواز آئی۔

”ہاں.....!“ سعید نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن تم کون ہو؟ میں کہاں ہوں۔“

”مجم جہاں بھی ہو خیریت سے ہو گے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔“

”میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں۔“ سعید نے پوچھا۔

”کسی بُری نیت سے نہیں۔ ایک خاص مقصد کے تحت جس کے پورا ہوتے ہی تم چھوڑ

دیے جاؤ گے۔“

”لیکن تم ایک جرم کر رہے ہو۔ کسی شہری کو اس طرح بند کر کے رکھنا قانوناً جرم ہے۔“

”میں جانتا ہوں..... لیکن تمہارا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ آواز آئی۔

”تم مجھے چھوڑ دو بہتر یہی ہے۔“

”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اگر تم بھاگنے کی کوشش کرو گے..... ذرا اور پر نظر اٹھاؤ..... وہ

روشن دان دیکھ رہے وہ جس سے کچھ کچھ روشنی آ رہی ہے۔ وہاں ایک آدی راقفل لئے تمہاری

نگرانی کر رہا ہے۔ تم بے اور اس نے گولی چلائی۔ کیا سمجھے!“

”تم آخر ہو کون.....؟“ سعید نے پوچھا۔

غالباً اس کے جواب میں ایک عجیب طرح کی کھٹکھاہٹ سنائی دی اور پھر آہستہ آہستہ وہی

کھٹکھاہٹ ایک وحشت ناک قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ سعید کے جسم کے سارے

رنگے کھڑے ہو گئے۔ ایسی بھیانک آواز والا اور اتنا پر اسرار قہقہہ اس نے آج تک نہ سنا تھا۔

آنے والے نے دفعتاً دیا سلائی جلائی اور سگریٹ سلگانے لگا۔

سعید کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ بُری طرح لرز رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ شہر کی پر رونق سڑک پر آ گیا۔ کلاک ٹاور نے نو بجائے۔ سردی کے مارے اس کا ہڑا حال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی کی اور دلاور پور کی طرف روازنہ ہو گیا۔ تمام راستہ وہ سوچتا رہا کہ اس کی بیوی اسے دیکھتے ہی رونا شروع کر دے گی۔ یقیناً وہ بہت زیادہ پریشان ہوگی اور اس لاش کا خیال آتے ہی وہ لرز اٹھا۔ کہیں پولیس نے اس کی بیوی کو پریشان نہ کیا ہو۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں حوالات میں بند کر دی گئی ہو۔ مگر وہ تو وہاں موجود تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لاش محض دھوکا ہو..... تو پھر اسے بند کر رکھنے کا کیا مقصد تھا اور وہ پراسرار اجنبی کہاں غائب ہو گیا۔ کیا اس آدمی کو کسی نے قتل کیا تھا۔ مگر وہ تو شمشیر بہادر کی حویلی میں دکھائی دیا تھا۔ کیا کچ مجبوت..... اور وہ انہی خیالات میں الجھا ہوا اپنے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہہ کر وہ کپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔

”کون ہے.....؟“ برآمدے سے ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

”میں ہوں.....؟“ سعید نے جواب دیا۔

”کون کسان صاحب۔“ دوسرے لمحے میں ایک باوردی پولیس مین اس کے سامنے کھڑا اسے نیچے سے اوپر تک دیکھ رہا تھا۔

”میری بیوی کہاں ہے؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”لاپتہ..... آپ دونوں کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔“

”وارنٹ.....؟“ سعید چونک کر بولا۔

”جی ہاں..... کیا یتیم صاحبہ آپ کے ساتھ نہیں؟“ پولیس مین نے پوچھا۔

”نہیں.....!“ سعید کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔

”آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ چوکی تک چلئے۔“

”چلو بھی چلو..... خدا کے لئے جلدی کرو..... آخر رضیہ کہاں گئی۔“ سعید نے کہا۔

ٹیکسی چوکی کی طرف جارہی تھی۔

سعید کو دیکھتے ہی ہیڈ کانسٹیبل اچھل پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ سعید اتنا ہر دلعزیز تھا کہ اس پر ایسے سنگین جرم کا الزام ہوتے ہوئے بھی پولیس والوں کے دل

”مگر تم..... تم.....!“ سعید ہٹکایا۔ ”تم..... میرے مکان میں تمہاری لاش.....!“

”تو کیا یہ دلچسپ بات نہیں۔“ آواز آئی۔

سعید کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کمرہ ہل رہا ہو۔

”اسی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو..... کہ تم کہاں ہو۔“ آواز پھر سنائی دی۔

”تم کا شانہ شمشیر میں ہو..... نام سنا ہے کبھی کا شانہ شمشیر کا۔“

”کا شانہ شمشیر.....“ سعید سوچنے لگا۔ ”کا شانہ شمشیر، کنور شمشیر بہادر کی حویلی..... جس

کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں بھوت رچتے ہیں۔“ سعید کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ

پڑا..... اور کمرہ اور زور سے ہلنے لگا۔ اس کا سر جھک رہا تھا۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ آہستہ

آہستہ ہوا میں اٹھ رہا ہو۔ ہچکولے لیتا ہوا سعید بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر ہوش میں آ گیا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ خود اپنی سانس کی آواز

اسے ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے پھر ہوا سمندر چٹانوں سے ٹکرا رہا ہو۔

کافی عرصے تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ روشندان جس سے کچھ دیر قبل دھندلی دھندلی

سی روشنی آ رہی تھی اب بالکل تاریک ہو چکا تھا۔ سعید آہستہ آہستہ دروازے کی طرف ریٹگنے لگا۔

تھوڑی دور چل کر وہ رک گیا لیکن کہیں کسی قسم کی کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ اس نے دروازے کو

پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس

نے دروازے میں تھوڑی سی درز کی اور باہر جھانکنے لگا۔ برآمدہ بالکل تاریک تھا اور چاروں طرف

سانا۔ وہ آہستہ آہستہ پیٹ کے بل ریٹگتا ہوا برآمدے میں آیا۔

اور اب وہ مہندی کی باڑھ کی اوٹ لے کر جھکا ہوا حتی الامکان تیزی سے چھانک کی طرف

دوڑ رہا تھا۔ ایک آدھ بار بچپن میں وہ اپنے باپ کے ساتھ یہاں آچکا تھا اس لئے اسے چھانک

تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ چھانک پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ پوری

عمارت سنسان پڑی تھی۔ قدم قدم پر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دہشت ناک قہقہہ کہیں دور نفا

میں گونج رہا ہو۔ چھانک سے نکلتے ہی اس نے اپنی پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔ آبادی

کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا دم پھول گیا۔

میں اس کی عزت تھی۔

”میں نے قتل نہیں کیا۔“ سعید بے ساختہ بولا۔

”ہمیں اس کا یقین ہے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

”میری بیوی کہاں ہے؟“

”اوہ تو کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں تھیں؟“

”نہیں.....!“ سعید نے کہا اور جلدی جلدی سارے واقعات دہرا دیئے۔

ہیڈ کانسٹیبل کے چہرے سے اس کی ذہنی الجھن صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ سعید کی داستان کا کون سا حصہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

”آپ کو میرے ساتھ شہر چلنا ہوگا۔“ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

”بھئی مجھے سردی لگ رہی ہے۔ ذرا گھر سے اور کوٹ تولے لوں۔“

”گھر میں آنریری مجسٹریٹ صاحب کے سامنے تالا لگ چکا ہے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

”میں اپنا کوٹ لے آتا ہوں۔“

سعید کی الجھن اور بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی شروع ہوئی۔

کوٹوالی کے ایک کمرے میں جگدیش فریدی اور سرجنٹ حمید بیٹھے آج کے واقعات پر تہہ

کر رہے تھے کہ اچانک ہیڈ کانسٹیبل سعید کو لے کر اندر داخل ہوا۔

”مجھے اس کی فکر نہیں کہ میں کس جرم میں مایخوذ کیا گیا ہوں۔ اس کا فیصلہ تو بعد کو ہوتا رہے

گا۔“ سعید نے کہا۔ ”مجھے سب سے زیادہ پریشانی اپنی بیوی کی ہے۔“

”وہ کہاں ہے؟“ جگدیش نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ سعید نے کہا اور ایک بار پھر اسے پوری داستان دہرائی پڑی۔

”کیا وہ لاجبئی کافی بھاری بھرکم معلوم ہو رہا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ سعیدی جلدی سے بولا۔ ”اس کی شخصیت میں یہی چیز سب سے زیادہ عجیب

تھی کہ وہ موٹا نہ ہونے کے باوجود بھی کافی بھاری بھرکم معلوم ہو رہا تھا۔“

”عمر.....؟“

”میرے خیال سے پچاس اور ساٹھ کے درمیان..... لیکن تندرستی بہت اچھی تھی۔“

”آنکھوں کا رنگ.....!“

”شاید بھورا تھا۔“

”خیر آگے چلے۔“

سعید بقیہ واقعات بتانے لگا۔ فریدی بغور اس کے چہرہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ جگدیش کے

چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ ایک لغو اور من گھڑت کہانی سن رہا ہو۔ کبھی کبھی اس کے

چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو جاتی تھی۔ لیکن فریدی قطعی سنجیدہ تھا۔

جب سعید داستان کے اس حصے پر پہنچا جہاں کا شانہ شمشیر کے بھوت کا تذکرہ تھا تو بے

اختیار جگدیش کو ہنسی آ گئی۔ سعید نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بے چارگی نفرت اور

غصہ سبھی کچھ تھا۔

”ہاں ہاں..... آپ بیان جاری رکھئے۔“ فریدی نے جگدیش کو گھورتے ہوئے کہا۔

سعید نے مختصر الفاظ میں داستان کا بقیہ حصہ بھی ختم کر دیا۔

”آپ کو یقین کامل ہے کہ وہ وہی شخص تھا جس کی لاش آپ نے اپنے کمرے میں دیکھی

تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اس پر مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ اس وقت آپ لوگوں کے پاس بیٹھا

ہوں۔“ سعید نے کہا۔

”تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ جگدیش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس عمارت کے متعلق عام

طور پر مشہور ہے کہ وہ آسیب زدہ ہے۔“

”میں یہ نہیں ثابت کرنا چاہتا۔“ سعید نے بے صبری سے کہا۔ ”میرا یقین ان لغویات پر

نہیں۔ مجھے جو حادثہ پیش آیا میں نے بیان کر دیا اور نہ مجھے اپنے اوپر لگائے گئے الزام کی پرواہ

ہے۔ اگر میں خدا کی نظروں میں بے قصور ہوں تو کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اپنی

بیوی کی گمشدگی کی وجہ سے پریشانی ہے۔ کہیں وہ بھی ان بد معاشوں کے چنگل میں نہ پھنس گئی ہو۔“

ہونا کچھ اچھی بات نہیں۔“

”تمہاری ڈفلی ہمیشہ الگ ہی ہوتی ہے۔“ فریدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ڈفلی کے علاوہ میں کبھی کبھی سارنگی اور ہارمونیم سے بھی شوق کر لیا کرتا ہوں۔“ حمید نے

شجیدگی سے کہا۔

”اچھا فضول بکوبیس۔“

فریدی یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا اور چند لمحوں بعد وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

حمید اور جگدیش چپکے سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی کھنٹی بجی اور فریدی چونک پڑا۔

”ہیلو.....!“ اس نے ریسور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں..... ہاں..... فریدی.....“

اچھا..... اچھا..... کیا کہا زمر دجمل میں..... نہیں نہیں دھوکا ہوا ہوگا..... کیا اس نے خرید لیا

تھا.....؟ مجھے اس کی اطلاع نہیں..... وہاں کرایہ دار بھی ہیں..... اچھا ان پر کڑی نظریں

رکھنا..... وحید اور کرن سنگھ کو بھی ابھی بھیجتا ہوں..... انہیں سب کچھ سمجھا کر تم واپس آ جانا..... اور

کوئی بات.....؟ وحید اور کرن سے کہہ دینا کہ اگر کوئی اور بات ہو تو مجھے گھر پر فون کر دیں.....

اچھا.....!“ فریدی نے ریسور رکھ دیا اور کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ ٹھہر کر

اس نے پھر فون پر کسی کو کچھ ہدایتیں دیں اور کمرے میں بے چینی سے ٹپکنے لگا۔

اتنے میں حمید اور جگدیش واپس آ گئے۔ فریدی بدستور ٹھہلا رہا۔

”تو تم لوگ چائے پی آئے۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ کے لئے بھی کہہ آیا ہوں آئی ری ہوگی۔“ جگدیش نے کہا۔

”جگدیش ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے سلیم کے متعلق بھی کچھ تحقیقات کی یا نہیں؟“

”کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“

”پتہ لگانے کا کون سا طریقہ اختیار کیا تھا۔“

”طریقہ؟ بات دراصل یہ ہے کہ گنگولی نے بھی نہیں بتایا اور پھر ادھر ادھر دلا اور پور.....!“

”معلوم نہیں تمہیں کب عقل آئے گی..... سب سے زیادہ ضروری چیز یہی تھی۔“

”تو آپ کا شبہ اسی بھاری بھر کم اجنبی پر ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”حالات کچھ ایسے پیش آئے جن کی بناء پر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں۔“ سعید نے جواب دیا۔

”ہمیں سو سو روپے کے نوٹ آپ کے یہاں پڑے ہوئے ملے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”پڑے ہوئے ملے تھے۔“ سعید نے کہا۔ ”کم از کم وہ میرے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ میں

بنک سے سو روپے کے نوٹ لیتا ہی نہیں اور اس دوران میں تو خاص طور پر میں نے سو کے نوٹ

کسی سے لئے ہی نہیں۔ لیکن ٹھہریے..... کیا آپ کو ڈرانگ روم میں وہ نوٹ ملے تھے۔“

”نہیں اسی کمرے میں صوفے کے پیچھے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔“

سعید کچھ سوچنے لگا۔

”جی نہیں..... وہ نوٹ میرے نہیں ہو سکتے۔“ سعید نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن آپ نے ڈرانگ روم کا حوالہ کیوں دیا۔“

”اس اجنبی نے مجھے وہاں اپنے یہاں ایک رات بسر کرنے کے لئے نوٹوں کا ایک بنڈل

دیا تھا جسے میں نے وہیں یہ کہہ کر ڈال دیا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“

”نوٹوں کا بنڈل.....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”جی ہاں۔“

”لیکن وہاں ہمیں کوئی بنڈل نہیں ملا۔“ فریدی نے کہا۔

”ممکن ہے وہ جاتے وقت اپنے ساتھ لیتا گیا ہو۔“ سعید نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد سعید کو حالات میں بند کر دیا گیا۔

”پھر وہی نوٹوں کا قصہ.....!“ فریدی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”بنک میں کچھ گڑبضر“

ہوئی ہے۔“

”کمال کر رہے ہیں آپ بھی۔“ حمید نے کہا۔ ”بنک والے کہتے ہیں کہ بقیہ ب

خریت ہے اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ۔“

”تم ابھی صاحب زادے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”اور میں انشاء اللہ ہمیشہ صاحب زادہ ہی رہوں گا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”کیونکہ غیر صاحبزادہ“

”غلطی ہوگئی۔“

”خیر..... وہ زمر محل میں رہتا تھا۔“

”زمر محل میں؟“

”ہاں..... اس نے اسے حال ہی میں خریدا تھا۔“

”خریدا تھا.....؟“ جگدیش پھر متعجبانہ انداز میں بولا۔

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟“

”کیا وہ واقعی بہت مالدار آدمی تھا.....؟“

”ہاں..... اور پرلے سرے کا کنبوس..... اور اسکے ساتھ اس کی ایک بیوہ بہن بھی رہتی تھی۔“

”بال بچے.....؟“

”کوئی نہیں..... اس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جگدیش نے ریسور اٹھالیا۔ پھر فریدی کی طرف بڑھ کر بولا۔ ”آپ

کا ہے۔“

”ہیلو..... ہاں..... ابھی وحید وغیرہ نہیں پہنچے..... اچھا..... اور کوئی خبر..... ہاں.....

ہاں.....!“

کوئی لمبی داستان تھی جسے فریدی بڑی توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ بار بار اس کے چہرے پر

تعجب کا اظہار ہونے لگتا تھا۔ آخر اس نے ریسور رکھ دیا۔

”دیکھو جگدیش.....!“ فریدی بولا۔ ”یہ سب کچھ دراصل تمہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں خواہ مخواہ اس محکمے میں پھنس گیا..... مجھے تو کسی فلم کمپنی

میں ہونا چاہئے تھا۔“

”خیر..... خیر.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ابھی ابھی سلیم کے متعلق کچھ اور بھی

دلچسپ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس کی کنجوسی کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ محض کرایہ وصول کرنے

کے لئے اس نے زمر محل جیسی شاندار عمارت کا استیماں کر دیا۔ جتنے حصوں میں اسے بانٹ سکا

تھا بانٹ کر انہیں کرائے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ خیر یہ تو معمولی بات ہے، حد ہوگئی کنجوسی کی کہ اس

جلد نمبر 3

پُر اسرار انجی

کی بہن اس کے گھر میں رہتے ہوئے کرایہ داروں کے لئے کھانا پکا کر بسا اوقات کرتی تھی اور وہ

کرایہ دار ایسے ہیں جن کے ساتھ ان کی بیویاں نہیں ہیں وہ اسی سے کھانا پکواتے ہیں۔“

”تو میرے خیال سے مجھے اسی وقت زمر محل میں جانا چاہئے۔“ جگدیش نے کہا۔

”یقیناً.....!“ فریدی بولا۔ ”اس وقت سارے کرایہ دار بھی موجود ہوں گے۔ ان سے سلیم

کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوں گے۔“

فریدی میدان عمل میں

فریدی اور حمید دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور فریدی نے ہاتھ

بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔

”ہیلو..... ہاں..... ہاں..... میں ہوں فریدی..... کیوں ابھی کیا معاملہ ہے..... کیا.....

کون غائب ہو گیا..... کیا کہا..... گنگولی؟..... کب..... دیکھو..... جگدیش معاملہ کافی بگڑتا جا رہا

ہے..... اور تم کوئی خاص دھیان نہیں دے رہے ہو۔ زمر محل کی انکوائری کا کیا رہا..... کچھ

نہیں..... بہت خوب..... تب تو خدا ہی مالک ہے..... میں ابھی فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا.....

بہر حال اب تو میں نے اس معاملہ کو ہاتھ میں لے ہی لیا ہے..... اچھا ابھی..... کھانا کھا رہا

ہوں.....!“ فریدی نے ریسور رکھ دیا۔

”سنا حمید.....!“ فریدی نے ریسور رکھ دیا۔

”خدا نے چاہا تو دو چار گھنٹے بعد اس کی لاش بھی کہیں نہ کہیں دستیاب ہو جائے گی۔“ حمید

نے کہا۔

”کیوں.....؟“ فریدی نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”جہاں آپ نے کسی کيس میں ہاتھ لگایا..... لاشوں میں برکت ہونی شروع ہو جاتی ہے“
”کیا فضول بک رہے ہو۔“

”خیر نہ گھوڑا دور، نہ میدان۔“

”فضول وقت نہ ضائع کرو۔ میں عجائب خانے جا رہا ہوں اور تمہارا اس وقت زمرہ نکل رہا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو پائے۔“

”ذرا اور وضاحت کے ساتھ کہئے۔“ حمید نے کہا۔

”مطلب یہ کہ وہاں سرجنٹ حمید علی کی حیثیت سے جانا..... زیادہ ہوشیاری کی ضرورت نہیں۔ مجھے وہاں کے کچھ کرایہ داروں پر شبہ ہے۔“

حمید کو کچھ اور ہدایتیں دے کر فریدی عجائب خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ عجائب خانہ منتظم فریدی کی آمد پر کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔

”میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔“ فریدی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں..... فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”یہاں کوئی آدمی سلیم نامی ملازم تھا.....؟“

”سلیم.....؟“ منتظم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”سلیم..... اوہ ناولٹ تو نہیں؟“

”جی ہاں.....!“ فریدی نے کہا۔ ”کیا اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ناولٹ ہے؟“

”جی ہاں..... کچھ عجیب ہی شخصیت کا آدمی تھا۔“

”یہاں اس کے سپرد کیا کام تھا.....؟“

”شعبہ کاغذات کی دیکھ بھال.....!“

”شعبہ کاغذات سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”ہمارے یہاں ایک سیکشن کاغذات کے نمونوں کا بھی ہے جہاں زمانہ قدیم سے“

اب تک کے کاغذات کے نمونے موجود ہیں۔“

”اوہ.....!“ فریدی کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اچانک ایک چاقو بڑی تیزی سے اس کے کاندھے کو مس کرتا ہوا اس کی پشت کی طرف ایک الماری کے شیشے سے جا ٹکرایا۔ فریدی اچھل کر اس کھڑکی کی طرف دوڑا جدھر سے چاقو آیا تھا۔ باہر راہداری بالکل سنسان پڑی تھی اور اسے کوئی متنفس نظر نہ آیا..... اس نے واپس آ کر چاقو دیکھا۔

منتظم کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی یہاں موجودگی کے دوران.....“ شیشے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔“ فریدی نے کہا اور رومال کو چاقو میں لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکل آیا۔

گھر پر حمید اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”کہو بھی ہو آئے.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں کئی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔“

”خیر وہ پھر سنوں گا۔“ فریدی نے الماری کھول کر اس میں سے ایک چاقو نکالا اور صدمہ

شیشے کے ذریعے اس کے دستے کو غور سے دیکھنے لگا۔

”کیوں حمید..... کیا یہ دونوں چاقو ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔“

”ہیں تو.....؟“

”ان میں سے ایک تو وہ ہے جو سعید منزل والی لاش سے نکالا گیا تھا اور دوسرا وہ جس سے

آج مجھ پر حملہ کیا گیا۔“

”آپ پر.....؟“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں.....!“ فریدی نے کہا اور اپنی عجائب خانے کی تفتیش کے متعلق بتانے لگا۔

”تو یہ کہئے آپ نے بنک اور سعید منزل کو ایک رشتہ میں منسلک کر ہی دیا۔“ حمید نے کہا۔

”اب ہمیں جیل میں چل کر سعید سے ملنا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

دونوں کار میں بیٹھ کر جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

کے اوقات ایسے ہیں کہ سلیم کی بہن نے بھی آج تک اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہ سرے کرایہ داروں سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس کے صورت آشنا نہیں ہیں۔

”یہ بھی مجھے معلوم۔“ فریدی نے کہا۔

”جب آپ کو سب معلوم ہی تھا تو آخر مجھے دوڑانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔

”نہیں تم ایک کام کی بات معلوم کر کے آئے ہو، جس کی اطلاع مجھے نہ تھی۔“ فریدی نے کہا۔

حمید اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”صندوق والی بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔

حمید خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”آخر صندوق والی بات آپ کو کیوں کام کی معلوم ہوئی۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس لئے کہ تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ

صفر مرزا رنگون سے آیا تھا۔“

”تو شاید آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ بھی سلیم ہی کے چچاں ٹھہرا تھا۔“

”میں یہ تو نہیں کہتا۔“ فریدی نے جواب دیا۔

پھر دونوں خیالات میں ڈوب گئے اور بقیہ راستہ خاموشی سے گزر گیا۔

سعید بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھتے ہی اس نے اپنی بیوی کے متعلق

پوچھا۔

”گھبراہٹ نہیں..... وہ بہت جلد مل جائیں گی۔“ فریدی نے کہا۔

”مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں۔“ سعید نے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں.....!“ فریدی نے کہا۔ ”میں ایک بات آپ سے پوچھنے کیلئے آیا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”آپ سلیم کو جانتے ہیں؟“

”کون سلیم.....؟“

”وہی جس سے ملنے کے لئے اکثر آپ عجائب خانے جایا کرتے تھے۔“

”کیا رہا تمہاری تفتیش کا.....؟“ فریدی نے راستے میں پوچھا۔

”سلیم کی بیوہ بہن سے ملاقات ہوئی۔ عمر تقریباً اٹھائیس سال رنگ گورا، آکھ

خصوصیت سے قابل ذکر..... ہنسنے وقت گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ پیروں کی بناوٹ

اس قسم کی ہے کہ دل میں بے اختیار گدگدی ہونے لگتی ہے۔ چال میں خفیف سی چلک ہے۔

سفید سلک کا غرارہ پہنے ہوئے تھی..... بس آپ سے کیا عرض کروں۔“

”کیا میں نے تمہیں وہاں اسی لئے بھیجا تھا۔“ فریدی نے برا سامنے بنا کر کہا۔

”پھر.....؟“ حمید نے بھولے پن کی ایکٹنگ کرتے ہوئے پوچھا۔

”بکومت.....!“ فریدی نے کہا۔ ”ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا۔“

”خیر سنئے.....!“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”عورت مشتبہ ہے۔ اس کے جہرے سے ملو

ہوا ہے کہ اس پر اس کے بھائی کی موت کا کوئی اثر نہیں۔ اس کا تذکرہ آنے پر وہ دوچار ٹھٹھا

سائیں ضرور بھرتی ہے لیکن بناوٹ کا چھپنا محال ہے۔“

”خیر یہ بالکل قدرتی امر ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بھائی کے ہوتے ہوئے بھی ا

خود محنت کر کے اپنا پیٹ پالنا پڑتا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ اپنے بھائی کی دولت کی تباہ و بربا

ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ منموں نہیں دکھائی دیتی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔“

”خیر دوسری بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”وہاں مجھے ایک ایسا صندوق نظر آیا جس پر رنگ

کی ایک جہاز ران کمپنی کی سلسپ چسکی ہوئی تھی۔“

”رنگون.....!“ فریدی چونک کر بولا۔ ”یہ بات تم نے کام کی بتائی۔“

”تیسری بات ملاحظہ ہو۔“ حمید فخریہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ ”مجھے صرف ایک کرایہ دار

مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ صبح چار بجے گھر سے چلا جاتا ہے اور بارہ بجے رات کو واپس آتا ہے۔“

”مجھے اس کی اطلاع ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خیر..... اس سے متعلق کیا معلوم کیا.....؟“

”یہاں سے کلکتے مچھلیاں بھیجتا ہے..... دلاور پور میں اس نے کئی گھاٹ لے رکھے ہیں

جہاں اس کے آدمی مچھلیاں پکڑتے ہیں اور وہ بھی غالباً دن بھر وہیں رہتا ہے اور اس کا نام؟

سجاد۔ شاہ جہاں پور کا رہنے والا ہے۔ اس کے پاس ایک کار بھی ہے۔ اس کے آنے اور جانے

”اوہ..... ہاں..... میں اسے جانتا ہوں۔“

”اس سے جان پچان کی نوعیت کیا تھی؟“

”میرے خیال سے تو اسے محض کاروباری ہی سمجھنا چاہئے۔“ سعید نے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”وہ مجھ سے مختلف قسم کے کانڈ بنانے کی تدبیریں پوچھا کرتا تھا۔“ سعید نے کہا۔

”کیا وہ اس کاروبار کو کرتا چاہتا تھا.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ دراصل ایک ناول نویس تھا۔ شاید اپنے کسی ناول میں کانڈ اور کانڈ

کارخانوں کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا۔“

”اوہ.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا وہ کبھی دلاور پور بھی جاتا تھا۔“

”اکثر.....!“

”آپ ہی سے ملنے یا کسی اور کے پاس۔“

”کسی دوسرے کے متعلق میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

فریدی پھر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”اچھا تو خاص طور پر کس قسم کے کانڈ کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔“ فریدی نے اچانک پوچھا۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ نوٹ بنانے والے کانڈ پر زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔“

”اوہ.....!“ فریدی نے کہا اور دفعتاً اسکی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو گئی۔

حمید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی چمک اس کی آنکھوں میں ک

موقعوں پر پیدا ہوتی ہے۔

”اچھا.....!“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے..... میں ایک بار پھر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ میری بیوی کا خیال رکھئے گا۔“

سعید بولا۔

”آپ مطمئن رہئے۔“

فریدی اور حمید جیلر کے دفتر میں آئے۔ راستے بھر فریدی قطعی خاموش رہا۔ دفتر میں آ کر

فریدی نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو..... جگدیش صاحب ہیں..... ذرا فون پر بلا دیجئے..... ہیلو جگدیش..... میں

فریدی بول رہا ہوں..... ہاں دیکھو بھئی..... مجھے شبہ ہے کہ نیشنل بینک میں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور

ہے..... آخر تم ہنس کیوں رہے ہو..... کیا یہ ممکن نہیں کہ وہاں کے نوٹ ہٹا کر ان کی جگہ پر انہی

نمبروں کے جعلی نوٹ رکھ دیئے گئے ہوں..... تم بینک ضرور جاؤ..... اور اپنے ساتھ ایک

ایکسپٹ کو بھی لیتے جانا..... اچھا فرض کرو اگر یہ نہ بھی ہوا تو تمہارا اس میں نقصان ہی کیا ہوگا.....

تم محض شے کی بناء پر سرکاری طور پر ایسا کر سکتے ہو..... گنگولی کا ایک بینک غائب ہو جانا مجھے اور

زیادہ شے میں ڈال رہا ہے..... اچھا..... میں تھوڑی دیر بعد کو توالی پہنچ جاؤں گا۔“

فریدی نے ریسیور رکھ دیا اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر حمید کو سر کے اشارے سے

باہر چلنے کے لئے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چنانچہ چند ہی سیکنڈ کے توقف کے بعد حمید بھی باہر آ گیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے

کو توالی پہنچ گئے۔

راستہ بھر فریدی نے سار جٹ حمید سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی، ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وہ گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا ہو اور اس کا ذہن تازہ ترین انکشافات کی کڑیاں گزشتہ

واقعات سے ملانے میں مصروف ہو۔

حمید نے کئی بار اسے مخاطب کیا لیکن فریدی ”ہوں ہوں“ میں ٹالتا رہا۔ کو توالی کے دفتر میں

پہنچ کر فریدی نے اپنے مخصوص انداز میں حمید کو مخاطب کیا۔

”کیا تم تازہ انکشاف کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ سکے ہو۔ حالات اگرچہ بظاہر بہت پیچیدہ

معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک سمجھ دار جاسوس کے لئے ان حالات کی کڑیاں ملانا کوئی مشکل امر

نہیں..... کیا خیال ہے تمہارا۔“ فریدی نے سگار سلگایا اور حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب.....؟“ حمید بولا۔ ”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے بینک اور سعید منزل

کے باہمی برائے اسرار تعلق کا راز سمجھ لیا ہے اور آپ مجرم کو کسی وقت بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”ہاں..... اور میرا خیال ہے کہ گنگولی اور سلیم کی سازشی اسکیم پر اسرار ہوتے ہوئے بھی

”لیکن اصل و نقل کا سمجھ لینا کسی عام آدمی کا کام نہیں۔“ ایکسپرٹ نے کہا۔ ”واٹر مارک صاف پانی کا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس میں قدرے میلا پن آ گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ پانی۔۔۔۔۔ یہ پانی۔“

”دریائے گھاگھرا کا ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

”ٹھیک۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک۔“ ایکسپرٹ نے اچھل کر کہا۔

”میں یہ دونوں نوٹ اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔“ ایکسپرٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی باقاعدہ رپورٹ آپ کو دوں گا۔“

ایکسپرٹ کے جانے کے بعد فریدی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”آؤ حمید۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ لیکن شاید کامیابی ہو ہی جائے، حالانکہ اب اس کی امید بہت کم رہ گئی ہے۔“

حمید نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”چلو دیر نہ کرو۔“ فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیا میں بھی چلوں۔“ جگدیش نے کہا۔

”نہیں کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”تم گنگولی کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔“

”اس کے غائب ہو جانے سے بینک میں سنسنی پھیل گئی ہے۔“ جگدیش نے کہا۔

”قدرتی بات ہے۔“ فریدی بولا۔

فریدی کی کار تیز رفتاری کے ساتھ دلاور پور والی سڑک پر جاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اچانک گاڑی روک دی۔ حمید اس غیر متوقع جھٹکے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کا سر ٹکرا گیا۔

”کیوں جناب۔۔۔۔۔ کیا میری جان فالتو ہے۔“ حمید کار سے اتر کر جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”تو بھی۔۔۔۔۔ پھر میرا مذاق تو کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ دونوں دلاور پور میں پن پچی کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر دھکا دیا، دروازہ کھل گیا اندر کوئی نہیں تھا۔ حمید ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔“

اب اتنی پراسرار نہیں رہی۔۔۔۔۔ جہلی نوٹوں کے بارے میں میرا شک اب یقین کی صورت میں کر گیا ہے۔ یقیناً بینک میں سلیم کی ملازمت کی اصل وجہ جہلی نوٹ ہی ہو سکتی ہے۔“

حمید فریدی کی اس بات پر چونکتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میرا خیال ہے اور جیسا کہ سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے سعید اس سازش میں براہد کا شریک اور مجرم ہے۔“

”تم رہے احق کے احق۔“ فریدی نے کہا۔

لیکن حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اگر تمہارا مطلب یہ ہو کہ سعید بھی اس سازش میں شریک تھا تو یہ ناممکن ہے۔ اگر ایسا تو وہ نوٹ کے کاغذ کا تذکرہ خصوصیت سے نہ کرتا۔“

”لیکن یہ دونوں نوٹ اسی کے گھر میں ملے تھے۔“ حمید نے کہا۔

”ایسی حالت میں تو اسے اور زیادہ محتاط رہنا چاہئے تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیونکہ ان نوٹوں کا تذکرہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔“

”بہر حال یہ ایک اچھا خاصہ معرہ ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ فریدی نے کہا اور سگارسلاگنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جگدیش اور ایکسپرٹ بھی کو توالی پہنچ گئے۔

”آپ نے جو دو نمبر بولے تھے ان کا مطلب میں نہیں سمجھا۔“ جگدیش نے کہا۔

”یہ ان دونوں نوٹوں کے نمبر تھے، جو ہم نے سعید منزل میں پائے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”ارے۔۔۔۔۔!“ جگدیش چونک پڑا۔

فریدی نے دونوں نوٹ ایکسپرٹ کی طرف بڑھا دیئے۔

ایکسپرٹ کافی دیر تک نوٹوں کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ سے سر اٹھا کر حیرت آمیز نظروں سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے آج تک اتنی شاندار نقل نہیں دیکھی۔“ وہ بولا۔ ”لیکن بتانے والا واٹر مارک میں دھوکا کھا گیا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ فریدی نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

فریدی کے اشارے پر وہ بھی بادل خواستہ اندر چلا آیا۔

”وہ جھکی عائب ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہوں.....!“

”عجیب آدمی ہو تم بھی..... یہ بھی کوئی بگڑنے روٹنے کا وقت ہے۔“

”تو میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”جھکی عائب ہو گیا ہے۔ اب ہم شاید ہی اسے پاسکیں۔“ فریدی بولا۔

”کہیں چلا گیا ہوگا..... عائب کیوں ہونے لگا۔“ حمید نے کہا۔

فریدی نے دریا کی طرف والی کھڑکی کھول دی۔

”دریا کبھی اس عمارت کی دیوار سے ٹکراتا ہوا بہتا رہا ہوگا۔“ فریدی بولا۔

”اور شاید یہاں سے پانی ہٹ جانے ہی کی وجہ سے چل بند ہوئی۔“

”بہت ممکن ہے کہ چکی رک جانے کی وجہ سے ہی پانی ہٹ گیا ہو۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”خیر شکر ہے کہ تم میں زندگی تو پیدا ہوئی۔“ فریدی نے کہا۔

وہ اس غلطی کے صندوق کی تلاشی لینے لگا لیکن کوئی قابل گرفت چیز نہ ملی۔

”آخر آپ یہاں آئے کیوں ہیں؟“

”جعلی نوٹ بنانے کے اوزاروں کی تلاش میں۔“

”یہاں.....!“ حمید حیرت سے بولا۔

”ہاں..... نہایت پرسکون جگہ ہے۔ سلیم جیسا سازشی، ایک ماہر فن مصور اور انگریز۔“

سعید جیسا تربیت یافتہ کاغذ بنانے والا..... پھر اور کیا چاہئے۔“

”تو آپ نے سعید کے متعلق اپنی رائے بدل دی؟“ حمید نے کہا۔

”ایسا تو نہیں..... اس کے متعلق میں نے شروع میں جو رائے قائم کی تھی اس میں کسی قسم

کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی۔“

”اپنی باتیں آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔“

”یہ کوئی ایسا الجھا ہوا معاملہ نہیں، فرض کرو میں کاغذ بنانا جانتا ہوں، تم مجھ سے یونہی دوڑنا

کر بیٹھے ہو، تمہارے ماتھے پر تو یہ لکھا نہیں کہ تم نے مجھ سے دوستی کیوں کی ہے۔ کچھ دنوں کے

بعد تم باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کاغذ بنانے کا طریقہ پوچھ لیتے ہو اور میری معلومات سے

ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نوٹ کا کاغذ بنا کر باقاعدہ جعلی نوٹ چھاپنے شروع کر دیتے ہو،

بھلا مجھے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔“

”لیکن جعلی نوٹ صرف سعید ہی کے یہاں کیوں ملے۔ سلیم کے گھر کا بھی تو کونا کونا چھان

ڈالا گیا ہے اور یہاں اس مصور کے سامان میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں مل سکی جو قابل گرفت ہو۔“

فریدی کچھ سوچنے لگا۔

”اگر تھوڑی دیر کے لئے آپ کا خیال صحیح مان بھی لیا جائے تو خود سعید کا بیان ہی اسے

مشتبہ بنا دیتا ہے۔“

”کون سا بیان.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وہی بھوت والا..... بھلا کسے یقین آئے گا۔“

”بہت ممکن ہے کہ اس نے بیچانے میں غلطی کی ہو۔ وہ کوئی اور آدمی رہا ہو۔ بہر حال مجھے

اس پر یقین ہے کہ وہ کسی گہری سازش کا شکار ہو گیا ہے۔“

”اگر آپ اس بناء پر اس کی مصومیت پر ایمان لائے ہیں کہ اس نے سلیم سے اپنے

تعلقات کا اعتراف کر لیا تو آپ غلطی کر رہے ہیں۔ یہ بھی اس کی ایک چال ہے میں یہ نہیں کہتا

کہ سلیم بے گناہ تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ جعلی نوٹ بنانا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ

مجھے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ سعید سلیم کا بھی قاتل ہے۔“

”بھلا وہ کیسے.....؟“ فریدی نے مسکرا کر پوچھا۔

”حصہ بانٹ میں جھگڑا ہو گیا ہوگا۔“

”تو اسے بنک کی چھت پر قتل کرنے کا کیا مقصد تھا اور پھر اس نے ایک اور دوسرے آدمی

کو اپنے گھر میں قتل کر کے یہ آفت کیوں مول لی۔“

”اوسہ ہوگا..... ماریے گولی..... آپ نے خواہ مخواہ یہ بلا اپنے گلے لگالی۔“ حمید اکتا

کر بولا۔

”میں.....!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”حمید صاحب بہت دنوں کے بعد اس قسم کی دلچسپ بلا نصیب ہوئی ہے۔“

حمید ایک اسٹول پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی تھی۔ فریدی پھر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ اس کی نگاہیں کچھ دور پر بہتے ہوئے دریا کی لہروں پر جی ہوئی تھیں۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔

”حمید ذرا یہاں تو آنا۔“

”کہئے.....!“ حمید بے دلی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔

”ادھر آؤ..... یہ نیچے دیکھو، کیا تم نے اس قسم کی جھاڑیاں اس علاقے میں کہیں اور بھی دیکھی ہیں؟“ فریدی نے دیوار کی جڑ میں اُگی ہوئی گھسی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ جھاڑیاں اتنی اونچی تھیں کہ انہوں نے تقریباً آدھی دیوار کو ڈھک رکھا تھا۔

”اس علاقے کے متعلق میری معلومات محدود ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”لیکن میں یہاں کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ فریدی بولا۔ ”میں نے یہاں اس قسم کی جھاڑیاں کہیں اور نہیں دیکھیں۔“

”نہ دیکھی ہوں گی۔“ حمید پتا سے بولا۔ ”آخر آپ انہیں اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔“

”اس لئے کہ یہ دیدہ و دانستہ لگائی گئی ہیں۔“

”لگائی گئی ہوں گی۔ پھر آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“

”یہاں ان کے لگانے کا مقصد.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”دیوار کو پانی کے ٹکڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے۔“

”بہت خوب..... اس وقت تم نے کافی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”لیکن پھر پین چکی کی چرخی کہاں لگائی گئی ہوگی۔“

”لگائی گئی ہوگی کہیں۔“ حمید اکتا کر بولا۔ ”آخر آپ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔“

”آؤ میرے ساتھ..... ابھی بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور حمید کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر

لے آیا۔

دونوں گھوم کر عمارت کی پشت پر پہنچے۔

”ادھر بھی نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”بلکہ یہاں بول کی کانٹے دار ٹہنیاں بھی رکھی ہوئی ہیں اور کچھ ہٹائی بھی گئی ہیں۔ ذرا آہستہ آہستہ انہیں جھاڑیوں سے الگ تو کرو۔“

دونوں بول کی ٹہنیوں کو کھینچ کر جھاڑیوں سے الگ کرنے لگے۔

حمید ضرورت سے زیادہ بیزار نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی مخبوط الحواس کے چکر میں پھنس کر ڈر رہا ہو۔

دونوں جھاڑیاں ہٹا رہے تھے کہ دفعتاً حمید ”ارے“ کہہ کر اچھل پڑا۔ دیوار کی جڑ میں جھاڑیوں کی باڑھ کے پیچھے ایک چھوٹی سی کھڑکی نظر آئی۔ ایسی کھڑکی جس سے آدھی بیٹھ کر بہ آسانی گزر سکتا ہے۔ فریدی نے کواڑوں کو دھکا دیا۔ دونوں پٹ کھل گئے۔ اندر سے سیلن اور چمکاڑوں کی بیٹھکی بدبو آ رہی تھی۔ فریدی نے جیب سے ٹارچ نکال کر اندھیرے میں روشنی ڈالی اور دوسرے لمحے میں وہ اس تہ خانے کے اندر تھا۔ حمید نے بھی آنا چاہا لیکن فریدی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر کھڑکی میں آیا۔

”اب آ جاؤ.....!“ اس نے کہا۔

حمید کھڑکی سے گزر کر ایسی جگہ آیا جہاں زینے تھے اور کالی گہرائی تک ان کا سلسلہ چلا گیا تھا۔

”اب یہاں کچھ نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ سب کچھ لے گئے۔“

”یعنی.....؟“

”کسی قسم کی مشین۔“

”مشین..... وہ کیسے معلوم ہوا۔“

”ان گڑھوں کی طرف دیکھو۔“ فریدی نے فرش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہاں کسی مشین کے چار پائے نصب تھے۔“

”کسی اور چیز کے بھی چار پائے ہو سکتے ہیں۔ مشین ہی کیوں۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچو.....!“ فریدی نے کہا۔ ”جو شخص اتنا ذہین ہو سکتا ہے کہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اتنا اچھا پلاٹ بنا سکے وہ اتنا بیوقوف بھی نہیں ہو سکتا کہ صفدر مرزا کی لاش کو قریب کے دریا میں پھینک دینے کی بجائے اتنی دردمندی مول لے۔ اگر وہ اسے دریا میں پھینک دیتا تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔“

”اپنا تو دماغ خراب ہو جاتا ہے اس معاملہ میں غور کرتے وقت۔“ حمید نے کہا۔

”آئیے..... چلیں..... میں تو آج رات کو تھوڑی سی تفریح کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور..... ضرور..... میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

فریدی اور حمید کو توالی لوٹ آئے۔ اس انکشاف سے سنسنی پھیل گئی اور جگدیش کو بھی یقین کامل ہو گیا تھا کہ اس سازش میں سعید کا ہاتھ ضرور ہے اس کے گھر میں جعلی نوٹوں کا پایا جانا اس کے حق میں خطرناک ثابت ہوا تھا۔ بہر حال ان سب میں ایک آدمی ضرور ایسا تھا جسے اب تک اس کی بے گناہی کا یقین تھا۔ یہ فریدی تھا اس نے شروع میں جو نظریہ قائم کیا تھا اسی پر آج بھی اڑا ہوا تھا۔ اس وقت حمید اور جگدیش ایک طرف ہو کر اس سے سعید کے خلاف بحث کر رہے تھے۔ دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جگدیش نے ریسیور اٹھالیا۔ پھر فریدی کی طرف بڑھ کر بولا۔

”آپ کے گھر سے کوئی بول رہا ہے۔“

”ہیلو..... ہاں..... اچھا..... تار آیا ہے..... اچھا احتیاط سے رکھو۔ میں ابھی آیا۔“

فریدی نے ریسیور رکھ کر اپنی فلت بیٹ اٹھائی۔

”بھئی میں چلا۔ حمید تم مجھے سات بجے آرکھو میں ملنا۔ رات کا کھانا وہیں کھائیں گے۔“

فریدی نے کہا اور کو توالی سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پر ایک لمبا چوڑا تار اس کا منظر تھا۔ فریدی نے تار لے کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھنے میں اس قدر منہمک تھا جیسے اس نے تار کے علاوہ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو بھلا دیا ہو۔ کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے وقت اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، غالباً کوئی خاص الجھن تھی۔ وہ ٹہلتا رہا۔ انگلیوں میں دبا ہوا سا گارنہ جانے کب کا بچھ چکا تھا جسے وہ بار بار بے خیالی میں ہونٹوں سے ہٹا لیتا تھا۔ آہستہ آہستہ تار کی پھیلی

”ایسا سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑا ہے۔“ فریدی نے جبکہ کر زمین پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھو تیل کے دھبے..... گاڑھے اور سیاہ تیل کے دھبے۔ غالباً یہ تیل مشین میں استعمال ہو کر جاتا رہا ہوگا۔“

”اوہ.....!“ حمید بولا۔ ”تو اس کا یہ مطلب کہ یہاں ان لوگوں کا نوٹ چھاپنے کا پریس تھا۔“

”تم صحیح سمجھ۔“ فریدی نے کہا۔ ”آؤ ہمیں..... وہ ہم سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔“

عجائب خانے میں مجھے قتل کر دینے میں ناکام رہنے کے بعد غالباً انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا ہے کہ مشین یہاں سے ہٹا دی۔“

وہ دونوں باہر آ گئے۔

”چلو بینک کا معاملہ تو صاف ہو گیا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا.....؟“

”سلیم وہاں ملازم تھا اور اس نے اپنی اصلی حیثیت ظاہر کر دی تھی اس لئے سب کو اس پر اعتماد تھا اس نے اس اعتماد سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے نوٹوں کے نمبر حاصل کئے اور انہی نمبروں کے جعلی نوٹ بنائے۔ اُس کا ثبوت ان دونوں نوٹوں سے ملتا ہے جو مجھے سعید منزل میں ملے تھے۔ پھر غالباً اس نے یہ پروگرام بنایا کہ بینک کے اصلی نوٹ نکال کر ان کی جگہ نقلی نوٹ رکھ دیئے تھے، کتنی شاندار سازش تھی..... ذرا سوچو تو کہ ایک بینک کے ذریعہ جعلی نوٹ تقسیم ہوتے بہر حال کوئی حادثہ پیش آ جانے کی وجہ سے سلیم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔“

”مگر..... مگر بینک میں گڑبڑ کی اطلاع تو آپ کو سلیم ہی نے دی تھی۔“

”مجھے اس میں شبہ ہے کیونکہ چھت پر میں نے جو خون کے دھبے دیکھے تھے وہ ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ قبل کے معلوم ہوتے تھے اور سلیم کا پیغام وہاں پہنچنے سے بیس منٹ پہلے مجھے موصول ہوا تھا۔“

”بہر حال بہت زیادہ الجھے ہوئے حالات ہیں۔“ حمید بولا۔ ”بینک کا معاملہ صاف ہو جانے پر بھی سلیم اور صفدر مرزا کے قتل باقی رہ جاتے ہیں۔ سعید کو آپ بے گناہوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ یہ ممکن ہے کہ سعید نے دیدہ و دانستہ ایسے حالات پیدا کئے ہوں جن سے اس کی بے گناہی ثابت ہو۔“

”س.....س.....سردی.....!“

”ٹھہرو..... ادھر سے آؤ“ وہ مہندی کی باڑھ جو صدر دروازے کے قریب جا کر ختم ہو گئی

تھی دونوں اس کی اوٹ میں آہستہ آہستہ ریگتے ہوئے آگے بڑھے۔

دوسرے لمحے میں فریدی کی ٹارچ کی روشنی صدر دروازے کے اندر پڑ رہی تھی۔ فریدی کو

صدر دروازے کے غیر مقفل ہونے پر قطعی حیرت نہ ہوئی۔ البتہ حید ضرور چونکا ہو گیا۔ اس نے

اپنے جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کے دستے کو بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں دیوار کا

سہارا لئے اندھیرے میں بڑھ رہے تھے۔ مختلف کمروں اور برآمدوں کا چکر لگاتے ہوئے وہ ایک

زینے کے قریب پہنچے۔ دفعتاً اوپر کے کمروں میں سے ایک میں روشنی دکھائی دی اور پھر فوراً ہی

اندھیرا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اندھیرے میں سگریٹ سلگا کر دیا سلائی بجھا دی ہو۔

”ہوشیار.....!“ فریدی نے حید کے کان میں کہا اور دونوں کے پستول ان کی جیبوں سے

نکل آئے۔

اچانک زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ فریدی اور حید ایک طرف کونے میں دبک

گئے۔ کوئی ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ دفعتاً فریدی نے اپنے پستول کا دستہ دیوار

پر مارا۔ کھٹکے کی آواز خالی عمارت میں گونج اٹھی اور اترنے والا ایک بیک رک گیا۔ سیٹی کی

آواز بند ہو گئی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ رک کر اس آواز کے متعلق سوچ رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے

بعد زینے پر پھر قدموں کی آواز معلوم ہوئی۔ فریدی نے چند لمحے ٹھہر کر دوبارہ ریوالور کا دستہ دیوار

پر مارا۔ اترنے والا پھر رک گیا..... ایک طویل خاموشی..... فریدی حید کے دل کی دھڑکن صاف

سن رہا تھا۔

دو تین زینے طے کرنے کے بعد ایک تاریک سایہ نیچے آ گیا۔ چند لمحے کھڑا وہ ادھر ادھر

دیکھتا رہا، لیکن جیسے ہی اس نے آگے بڑھنا چاہا فریدی نے پھر وہی حرکت کی۔ آنے والے نے

اپنی انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو فرش پر گر کر پیر سے مسل دیا۔

”صغور مرزا.....!“ دفعتاً فریدی نے تیز قسم کی سرگوشی کی۔

تاریک سایہ اچھل پڑا۔

جاری تھی۔ وہ ابھی تک بدستور ٹھہل رہا تھا۔ کلاک نے چھ بجائے اور وہ چونک پڑا۔ کمرہ بالکل تاریک ہو چکا تھا۔ اس نے سوچ بچوڑ کے قریب جا کر بجلی جلا دی۔

میز کی دراز سے دو پستول نکال کر فریدی نے جیب میں رکھے۔ چتر کا ندھے پر ڈالا فلٹر

ہیٹ کا گوشہ پیشانی پر جھکاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

بھوت اور فریدی

فریدی کی کار تیزی سے شہر کے غیر آباد حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خاموشی سے اکثر

حید نے پوچھا۔

”کچھ بتائیے گا بھی یا یونہی کہیں لے جا کر جھونک دینے کا ارادہ ہے۔“

”آج ایک بھوت کو دو بھوتوں سے پھینکا پڑے گا۔“

آہستہ آہستہ فریدی کی کار کی رفتار کم کرتا جا رہا تھا۔ شہر کا یہ حصہ قریب قریب بالکل ویران اور

تاریک تھا۔ کار سڑک سے ہٹ کر کچی زمین کے نشیب و فراز میں بچکولے لیتی چلی جا رہی تھی۔

کچھ دور پر سامنے ایک بڑی سی عمارت دکھائی دی، جس کی چہار دیواری کافی رقبہ میں پھیلی

ہوئی تھی۔ فریدی نے کار کھڑی کر دی اور حید کو اترنے کا اشارہ کر کے خود بھی نیچے اتر گیا۔ دونوں

قد آدم چہار دیواری کے نیچے آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ چہار دیواری کے موڑ پر سلاخ دار پھانک تھا

جس میں ایک بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ فریدی نے تالے کو ٹٹولا اور چند لمحوں تک کھڑا سوچا رہا۔

پھر زمین پر بیٹھ کر ایک فٹ اٹھے ہوئے پھانک کے درمیانی خلاء کا اندازہ کرنے کے بعد بنے

کے بل ریگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

حید نے بھی اس کی تقلید کی۔

اندر چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ستاروں کی دھندلی سی روشنی میں

کا شانہ شمشیر کی طویل و عریض عمارت کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ حید کے جسم پر کپکپاہٹ طاری

ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”صفدر مرزا!.....“ فریدی نے پھر اسی انداز میں کہا۔

سائے نے مڑ کر آہستہ آہستہ ان دونوں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

”تم کون ہو بھائی!.....“ سایہ نرم لہجے میں آہستہ سے بولا۔

”میں کوئی بھی ہوں لیکن تمہارا بھائی انور مرزا تم سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہے

فریدی نے اسی انداز میں جواب دیا اور اس کی سرگوشی اندھیرے میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ سرگوشی کچھ اتنی بھیاں تک تھی کہ خود حمید کے روکنے کھڑے ہو گئے۔ اسے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے

کوئی روح بول رہی ہو۔

سایہ ایک بار پھر اچھل پڑا۔

”تم کون ہو بھائی!.....“ سائے نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔ اس کی آواز میں پچکار گئی تھی۔

”کنور شمشیر بہادر!.....“ فریدی نے بے ساختہ کہا۔

دفعتاً سایہ لڑکھڑا کر برآمدے کے ستون سے ٹک گیا۔

”کیوں کیا ڈر گئے!.....“ فریدی بولا۔

”تو تم زندہ ہو۔“ وہ ایسے لہجے میں بولا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

فریدی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ کتنا بھیاں تک تھا وہ قہقہہ۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے

درو دیوار اس قہقہے کو دہرا رہے ہوں۔ فریدی خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اس پر اپنے قہقہے کا رد گوارا

محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نہیں تم جھوٹ کہتے ہو۔“ سایہ بولا۔ ”میرا نشانہ کبھی خطا!.....“

”نہیں کرتا!.....“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

دفعتاً سایہ ادھر ادھر جھومنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو کر مرنے والا ہے۔

اور پھر وہ صحن کی طرف لڑھک گیا۔

فریدی اور حمید جھپٹے۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس کے منہ سے حیرت کی چیخ نکل گئی۔ جس جگہ سایہ گرا تھا۔

وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”ارے!.....“ یہ کدھر غائب ہو گیا۔“ فریدی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اندھیرے میں آخروہ کہیں گولی نہ چلا دے۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

فریدی نے ٹارچ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صفدر مرزا!..... صاف نکل گیا۔“

”صفدر!..... صفدر مرزا!..... مگر وہ تو!.....!“

”مرا نہیں!.....!“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

”مجھے شبہ ہے کہ سعید کی بیوی یہیں اسی عمارت میں کہیں قید ہے۔“

”مگر صفدر مرزا!.....!“

”چھوڑو بھی!..... پھر کبھی اطمینان سے بتاؤں گا۔ باتوں میں وقت خراب کرنے کا موقع

نہیں۔ نیچے کے سارے حصے تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ اب اوپر چلنا چاہئے۔“ فریدی نے

اس زینے پر چڑھتے ہوئے کہا جس پر سے صفدر مرزا اتر ا تھا۔ ”یہاں اس سنان عمارت میں اس

کی موجودگی خالی از علت نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ سعید کی بیوی بھی یہیں کہیں بند ہو۔“

حمید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے زینے طے کر رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں

اس نے فریدی کے بازو کو بری طرح جکڑ لیا۔

”کیا ہے!.....؟“ فریدی نے پلٹ کر کہا۔

”آہٹ!..... اوپر کوئی ہے۔“

”میں سن رہا ہوں۔“

”تو پھر اس طرح!..... کیا اندھیرے میں جان دیجئے گا!..... یہ ضروری نہیں کہ وہ اس

عمارت میں تھا ہی رہا ہو۔“ حمید نے کہا۔

”چھوڑو بھی!..... محض تمہاری احتیاط کے چکر میں میں نے صفدر مرزا کو ہاتھ سے کھو دیا۔“

”خیر چلئے!..... اگر آپ کے ساتھ ہی مرنا قسمت میں لکھا ہے تو پورا ہو کر رہے گا۔“

اوپر ایک ہی قطار میں متعدد کمرے تھے۔ فریدی نے ہر کمرے کے سامنے رک رک کر

آہٹ لیتی شروع کی۔ ایک کمرے سے دہلی دہلی سکینوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ کمرہ باہر سے

منقل تھا۔ فریدی نے جیب سے ریوالتور نکالا اور اس کی نال کو تالے کے کڈے میں پھنسا کر

ایٹھنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تالا کھل گیا۔

”تم زینے کے دروازے کے پاس جاؤ۔“ فریدی نے آہستہ سے حمید سے کہا۔

”اگر کوئی اوپر آنے کی کوشش کرے تو بے دریغ فائر کر دینا۔“

حمید چلا گیا۔ فریدی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر نارنج کی روشنی اندر لائے۔ سامنے پلنگ پر ایک عورت لیٹی سر اٹھائے خوفزدہ نظروں سے نارنج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں..... اب تم محفوظ ہو۔“ فریدی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

عورت گھبرائے ہوئے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا تم سعید کی بیوی ہو.....؟“

”آخر تم لوگ مجھ بے گناہ کو کیوں تنگ کر رہے ہو.....؟“ عورت بولی۔

”آپ غلط سمجھیں محترمہ۔“ فریدی نے کہا۔ ”میرا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔“

”اوہ.....!“ عورت کے منہ سے خوشی کی چیخ نکلی اور وہ بے تحاشہ کھڑی ہو گئی۔

”آپ سعید کی بیوی ہیں نا۔“

”جی ہاں۔“

”آئیے..... میرے ساتھ۔“

فریدی اسے ساتھ لے کر زینے کے دروازے کے پاس آیا جہاں حمید کھڑا تھا۔

تینوں سرنگ کے ذریعہ عمارت سے باہر نکل آئے۔

فریدی سعید کی بیوی کو اپنے گھر لے آیا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ چلی تو آئی تھی لیکن

کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کی طرف سے مشکوک ہے۔

”آپ اس عمارت میں کب سے تھیں؟“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”کل سے.....!“

”کل سے.....؟“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”مگر آپ تو آج

دن سے غائب تھیں۔“

”پہلے دوسرے مکان میں تھی۔“

”کیا آپ اس کا کچھ پتہ نشان دے سکتی ہیں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ میں بے ہوشی کی حالت میں وہاں لے جائی گئی تھی۔“

”بے ہوشی کی حالت میں؟“

”جی ہاں.....!“ اس نے کہا اور فریدی کے استفسار پر اس نے اپنے بے ہوش ہونے تک

کے واقعات بتا دیئے۔

”اور پھر میں نے اس شخص کو زندہ دیکھا جس کی لاش میں اپنے گھر میں دیکھ چکی تھی۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے حمید کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”اس بھاری بھر کم اجنبی کی

شخصیت ابھی تک معمرہ بنی ہوئی ہے۔ آخر وہ کون تھا اور اس کا مقصد کیا تھا۔“

”اور یہ کیا معمرہ نہیں کہ جس شخص کی لاش ہم لوگوں نے دیکھی اسے یہ لوگ زندہ بتاتے

ہیں۔“ حمید نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”صرف یہی لوگ زندہ نہیں بتاتے بلکہ ہم لوگ بھی ابھی اس سے دھوکا کھا چکے ہیں۔“

فریدی نے کہا۔

”یعنی.....؟“

”صفر مرزا.....!“

”کمال کر رہے ہیں آپ بھی۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔ ”پھر وہ مرنے والا کون تھا.....؟“

”اس کا بھائی۔“

”بھائی.....؟“ حمید تقریباً اچھل کر بولا۔

”ہاں اس کا جڑواں بھائی انور مرزا۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟“

”میں نے رنگون میں انکوائری کرائی تھی۔ آج وہاں کے محکمہ جاسوسی کے چیف کا مفصل تار

آیا ہے، انور مرزا اور صفر مرزا جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں اس درجہ مشابہت پائی جاتی تھی کہ

ان کے ملنے جلنے والے بھی اکثر گڑبڑا جاتے تھے۔ دونوں میں صرف ایک معمولی سا فرق تھا۔

انور مرزا کے بائیں تھکنے کے نیچے ایک ابھرا ہوا سیاہ تل تھا۔ ہاں تو وہاں کی انکوائری کے مطابق

دونوں چھٹے ہوئے بد معاش تھے۔ صفدر مرزا تو کئی بار جیل بھی جا چکا ہے۔ صفدر مرزا ہندوستان چلا آیا تھا اور نور مرزا بعد کو آیا۔“

”لیکن اسے قتل کس نے کر دیا.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”مجھے تو اس میں صفدر مرزا ہی کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔“

”وہ کیسے.....؟“

”لاش ملنے کے بعد صفدر مرزا کے قتل کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی اور اس کی تو بھی چھپی تھی۔ اگر صفدر مرزا کا ہاتھ اس قتل میں نہیں تھا تو اس نے پولیس کو مطلع کیوں نہیں کیا وہ زندہ ہے اور مقتول اس کا بھائی تھا۔ اس کے بجائے اس نے سعید کو پھنسانے کی کوشش کی اسے اس بات کا یقین دلا کر کہ وہ بھوت تھا۔ وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع جان بوجھ کر دیا۔ وہ وہاں سے نکل کر اس کی رپورٹ پولیس کو دے اور دھریا جائے۔ بھلا پولیس ان لغویات کیوں یقین کرنے لگی۔ سعید کی بیوی کو اس نے اپنے قبضہ ہی میں رکھا تا کہ پولیس سعید کو مجرم سمجھ لے اور اس پر یقین کر لے کہ خود اس نے اپنی بیوی کو کہیں چھپا دیا ہے اور اب اسے چھنکارے کے لئے ایک داستان تصنیف کر لایا ہے۔“

”تو کیا وہ قید کر لئے گئے؟“ سعید کی بیوی گھبرا کر بولی۔

”جی ہاں۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ بہت جلد چھوٹ جائے گا۔“

”ان کے خلاف سازش کرنے والوں کا پتہ میں نے لگایا ہے۔“

”مجھے ان سے ملا دیجئے۔“ وہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔

”میں فی الحال اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ ایسی صورت میں آپ بھی قید کر لی جائیں گی۔“

”مجرم بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”جب تک کہ اصلی مجرم گرفتار نہ ہو جائے..... غریب خانے ہی کو گھر سمجھئے۔ یہاں آپ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اگر آپ نے اس گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر میں سعید اور آپ کے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔ اچھا اب چل کر آرام کیجئے۔ چلے میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“

فریدی اسے ایک کمرے میں پہنچا کر لوٹ آیا۔ حمید خاموش بیٹھا خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

”آخراً آپ نے یہ کیوں کہا کہ اس کے ظاہر ہوتے ہی مجرم فرار ہو جائے گا۔ کیا اس کے فرار ہونے کے لئے آج کا حادثہ کم ہے؟“ حمید نے کہا۔

”یہی تو تم نہیں سمجھتے۔ آج کی بھاگ دوڑ میں ایک نئی بات اور معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ صفدر

مرزا شمشیر بہادر کا بھی قاتل ہے۔ کیا تم نے میری اور اس کی گفتگو دھیان سے نہیں سنی تھی۔ میں

اس معاملے میں بھی شروع ہی سے مشکوک تھا اور شاید میں نے اپنے شبہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ

رنگون ہی میں شمشیر بہادر کا انتقال ہوا اور وہیں سے صفدر مرزا بھی ہندوستان آیا۔ لیکن یہ محض شبہ

ہی تھا۔ میں نے وہاں اسے شمشیر بہادر کا حوالہ اس خیال سے قطعی نہیں دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ

جب اس نے خود کو بھوت بنا کر پیش کیا تھا تو کیوں نہ میں بھی شمشیر بہادر کا بھوت بن کر اسے

پہچان میں مبتلا کروں۔ لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا..... بہر حال وہ میرے فقرے کو حقیقت

سمجھا تھا۔ وہ کل تک واقعات کی نئی کروٹ کا انتظار ضرور کرے گا۔ اگر سعید کی بیوی حاضر نہ ہوئی

تو وہ یہی نتیجہ نکالے گا کہ وہ ابھی تک شمشیر بہادر ہی کے قبضہ میں ہے۔ شمشیر بہادر جو اس سے

انتقام لینے کی تاک میں ہے وہ اس لئے شہر نہیں چھوڑے گا کہ وہ کسی طرح موقع پا کر شمشیر بہادر

کو ٹھکانے لگا دے گا اور اگر سعید کی بیوی حاضر نہ ہوئی تو وہ اسے پولیس والوں کی چال سمجھ کر فرار

ہو جائے گا کیونکہ ایسی صورت میں سعید کی بیوی کے ساتھ ہی ساتھ شمشیر بہادر کا ہونا بھی ضروری

ہے اور شمشیر بہادر مرچکا ہے کیا سمجھئے؟“

”بالکل سمجھ گیا.....!“ حمید نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”آپ کا دماغ ہے یا.....!“

”بھٹیلا خانہ.....!“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

”خیر یہ آپ کی نیک نفسی ہے..... کہ آپ اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔“ حمید نے

ہنس کر کہا۔

”اونہہ..... پھر تم نے اپنے سستے قسم کے مذاق کا مظاہرہ شروع کر دیا۔“ فریدی نے منہ بنا

کر کہا۔ ”ایک چیز مجھے اب بھی الجھن میں ڈالے ہوئے ہے کہ آخر وہ بھاری بھر کم اجنبی کون

تھا۔ حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی صفدر مرزا ہی کا شکار تھا اور صفدر مرزا اس کا پیچھا کیوں

کر رہا تھا۔ وہ دونوں جعلی نوٹ اسی بنڈل کے تھے جو اس نے سعید کو دیا تھا۔ کیا سلیم اور مرزا کی موت کا کچھ تعلق اس کی ذات سے بھی ہے۔ خیر انور مرزا کا معاملہ تو یہ بھی ہو سکتا ہے اجنبی کا پیچھا کرنے والوں میں وہ بھی رہا ہو اور اجنبی ہی کے دھوکے میں صدر مرزا کے ہاتھ مارا گیا ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ حمید نے کہا۔

”فرض کرو اجنبی آگے بھاگ رہا ہے اس کے پیچھے انور مرزا ہے اور اس کے پیچھے مرزا..... اچانک صدر چاقو نکال کر اجنبی کو کھینچ مارتا ہے اور انور مرزا اسی دوران میں بحالت خبری درمیان میں آ جاتا ہے، چاقو اجنبی کے گلے کے بجائے اسے ہی لگ جاتا ہے۔“

”اس طرح تو ممکن ہے۔“ حمید نے کہا۔

”صدر مرزا چاقو پھینکنے میں بہت مشاق معلوم ہوتا ہے کیونکہ عجائب گھر میں اسی نے مجھ حملہ کیا تھا۔ چاقوؤں کی ایک جیسی ساخت اس کا بہترین ثبوت ہے۔“

”لیکن پھر سلیم کا معاملہ بالکل الگ جا پڑتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”یہی تو ایک ایسی گرہ ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بس سلیم کی موت اور اس اجنبی کی شخصیت

کا حال ظاہر ہو جائے تو کیس صاف ہے۔“

”تو پھر اس کے لئے آپ کون سا طریقہ کار اختیار کریں گے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ابھی اس پر بہت کچھ سوچنا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن محض شبے کی بناء پر میں

فی الحال جو طریقہ کار اختیار کیا ہے ابھی اس پر کاربند رہنے کا ارادہ ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”سلیم کے گھر کی نگرانی۔“ فریدی نے کہا۔ ”اسکی بہن کی شخصیت بھی کچھ کم پراسرار نہیں۔“

”امید ہے کہ اب میری ضرورت آپ کو پیش نہ آئے گی۔“

”جی نہیں..... ایسے کاموں کے لئے دوسرے قسم کے مہرے رکھتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”اچھا اب آپ آرام فرمائیے..... بندہ رخصت ہوتا ہے۔“

مردہ محل میں

سلیم کی بہن بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس نے اس وقت سفید سلک کا غرارہ اور سفید جیمز پہن رکھا تھا۔ سیاہ دوپٹے میں سفید کپڑوں کے ساتھ اس کی رخصت ہوتی ہوئی جوانی نے گویا سنبھالا۔ لے لیا تھا۔ بھرے ہوئے سلونے رخساروں پر دوہل کھائی ننھی ننھی لٹیں اس کے چہرے کی سنجیدگی میں ہلکی سی شوخی کا اضافہ کر رہی تھیں اور سنجیدگی و شوخی کے اس حسین امتزاج نے اس کی شخصیت کو کافی حد تک پرکشش بنا دیا تھا۔

دفن ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا لمبوترے چہرے اور طوطے جیسی ناک والا۔ یہ صدر مرزا تھا۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلیم کی بہن نے مڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ صدر مرزا بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ سلیم کی بہن سے نظر ملتے ہی وہ بے اختیار مسکرا پڑا لیکن اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

”سلیم..... آخر تم مجھ سے اس قدر بیزار کیوں رہتی ہو۔“

”کیا فضول اور لغو گفتگو چھیڑ دی۔“ اس نے بیزاری سے کہا۔

”آخر اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو۔“

”اور تم اس بڑی طرح ہانپ کیوں رہی ہو۔“ وہ طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔“

”وہ کیا.....؟“ عورت چونک کر بولی۔

”میرا چچا زاد بھائی شمشیر بہادر زندہ ہے۔ معلوم نہیں کس طرح بچ گیا۔ کاشانہ شمشیر میں

ابھی اس سے ٹڈبھڑ ہو گئی۔ میرے جیب میں پستول بھی نہیں تھا۔ مجبوراً بھاگنا پڑا۔ وہ سعید کی

بیوی کو بھی نکال لے گیا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اگر وہ اسے لے کر کوئالی پہنچ گیا تو

مجبوراً مجھے بھاگنا ہی پڑے گا۔ اگر بنک والے معاملے کا پتہ لگانے کی کوشش کروں گا تو گردن ہی

نپ جائے گی۔“

”تو تمہیں روکا کس نے ہے۔“ سلیمہ بے رخی سے بولی۔

”بڑی بے مروت ہو تم۔“

”بات یہ ہے کہ مجھے قاتلوں سے نفرت ہے۔“

”آخر ہونا عورت۔“

”تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ میں نے بھائی صاحب سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ تمہیں کام میں شریک نہ کریں۔“

”تو میری وجہ سے کیا نقصان ہوا۔“

”نقصان.....!“ سلیمہ گرج کر بولی۔ ”انہیں کس نے قتل کیا؟“

”تو کیا..... تو کیا.....!“ صفدر مرزا رک کر بولا۔ ”تمہیں مجھ پر شبہ ہے۔“

”اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“

”غلط فہمی میں پڑ کر آپس کے تعلقات مت خراب کرو۔ اس وقت ہم سب مصیبت میں مبتلا ہیں۔“

”تم مبتلا ہو گے مصیبت.....“ سلیمہ تیز لہجہ میں بولی۔ ”میں ہر طرح مطمئن ہوں۔“

”اگر میں وہ مشین دلا دوں پور سے نہ لاتا تو دیکھتا تمہارا اطمینان۔“

”مشین..... کیا تم وہ مشین وہاں سے لے آئے۔“

”ہاں.....؟“

”اس لئے کہ جاسوس فریدی نوٹوں کے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔“

”وہ کیسے.....؟“

”وہ عجائب گھر گیا تھا۔ وہاں سے اس نے سلیم کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ وہ“

اسے سعید اور سلیم کی جان پہچان کا بھی علم ہوا۔ میں اسے ختم کر ہی دیتا مگر وہ بچ گیا۔ زندگی پہلی بار میرے چاقو کا وار خالی گیا ہے۔“

”بوازد بردست کارنامہ سرانجام دیا تم نے۔“ سلیمہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ ”اس طرح“

اسے خواہ مخواہ چھیڑ کر واقعی ہم لوگوں کے لئے مصیبت کا باعث بنو گے اور میں کہتی ہوں کہ اس مشین کو وہاں سے لانے کی کیا ضرورت تھی اس کے فرشتے بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔“

”میں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔“

”تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا۔“

”میں نے ضروری نہیں سمجھا..... میں عورتوں کے حکم کا خطرہ نہ بننے کا عادی نہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے..... یہ نہ سمجھنا کہ سلیم مر گیا۔“ سلیمہ کڑے لہجہ میں بولی۔

”تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔“ صفدر مرزا نرم لہجے میں بولا۔ ”اچھا بھئی..... مجھ سے غلطی ہوئی معافی چاہتا ہوں۔“

سلیمہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”اب ششیر بہادر کے معاملے میں کیا ہوگا۔“

”یہی تو سوچ رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ خود کو ظاہر کرے گا کیونکہ شاید وہ شروع ہی سے

میرے پیچھے لگا ہوگا اگر اسے کوئی قانونی کارروائی کرنی ہوتی تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ مجھے تو کچھ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ بینک کی گزبڑ میں اسی کا ہاتھ ہے۔“

”تب تو یہ بات بڑی بڑی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں..... اگر اس نے کل تک سعید کی بیوی کو حاضر نہ کیا تو اس کا بھی صفایا

ہو جائے گا ورنہ پھر مجھے ہی بھاگنا پڑے گا۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس کرایہ دار کی ہے، معلوم نہیں کیوں بھائی

صاحب نے اسے کرایہ پر کمرے دے دیئے تھے، آج دو دن سے غائب ہے، سمجھ میں نہیں آیا

کہ وہ دراصل ہے کون۔“

”میں نے بھی آج تک اسے نہیں دیکھا۔“ صفدر مرزا بولا۔

”اس کا پتہ لگانا ضروری ہے۔“ سلیمہ بولی۔ ”اگر کہیں سرکاری جاسوس ہوا تو..... شامت

ی آجائے گی۔“

”خیر اسے بھی دیکھ لیا جائے گا۔“ صفدر مرزا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”خفیہ پولیس نے نوٹوں کا حال معلوم کر لیا ہے لیکن شاید ابھی تک اسے سلیم کے حالات کا علم نہیں۔ ورنہ یہ مکان کبھی کا گھر گیا ہوتا۔“

”نہیں..... اس مسئلے کو لا پرواہی سے نہ ٹالو..... تم نے فریدی کو چھین کر اچھا نہیں کیا۔ وہ خطرناک آدمی ہے جس نے جابر اور لیونارڈ ایسے بین الاقوامی مجرموں کے چھکے چھڑا دیئے وہم جیسوں کو کب خاطر میں لائے گا۔“

”اور تم بھی خواہ مخواہ ڈر رہی ہو جس دن چاقو پڑ گیا خاک و خون میں لوٹنا نظر آئے گا ایسے ایسے بہت دیکھے ہیں۔“

”خیر..... بہر حال ہمیں کافی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ سلیم بولی۔

پھر خاموشی چھا گئی اور صفدر مرزا سلیم کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

سلیم کا گرگا

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ کمرے کی چادر ہر شے پر محیط تھی۔ سلیم نے ایک طویل انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھی۔ دفعتاً باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سلیم نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک اجنبی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ گھنی سیاہ رنگ کی داڑھی میں اس کا خوش رنگ چہرہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک نہایت نفیس قسم کا سوٹ تھا جس پر اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر عمدہ فیٹ تھی۔

”شاید آپ بانو سلیم ہیں۔“ اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں کہئے۔“

”تکلفات کا وقت نہیں۔“ اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اندر آنے دیجئے۔“

سلیم متحیر انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ اجنبی اندر چلا گیا۔ سلیم بدستور اسے متحیرانہ انداز میں گھورے جا رہی تھی۔

”گھبرائیے نہیں بانو۔“ اجنبی بولا۔ ”میں دوست ہی ہوں..... مجھے توخیر کہتے ہیں۔“

”توخیر.....؟“ سلیم نے حیرت سے ہا۔ ”میں یہ نام آج ہی سن رہی ہوں۔“

”لیکن آپ مجھے صورت سے ضرور پہچانتی ہوں گی۔“ اجنبی نے کہا اور اپنے چہرے سے

منوعی ڈاڑھی ہٹا دی۔ سلیم کی آنکھیں چندھیا اٹھیں۔ کتنا بارعب اور حسین چہرہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔

”میں..... میں.....؟“ سلیم ہکلائی۔ ”مم..... مجھے افسوس ہے کہ میں نے اب بھی نہیں پہچانا۔“

”تو شاید آپ نے استاد مرحوم کے الہم میں میری تصویر بھی نہیں دیکھی۔ میں نے آپ کی

تصویر دیکھی تھی۔ اسی لئے آپ کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔“

”آپ وضاحت سے اپنے متعلق بتائیے۔“ سلیم نے آہستہ سے کہا۔

”میں بمبئی سے آرہا ہوں..... میں وہاں استاد کے حکم کے مطابق نوٹوں کا انتظام کر رہا تھا

کہ دفعتاً ان کی موت کی خبر ملی۔ اس سے سباری تنظیم میں ہلچل پڑ گئی۔ میں نے کل رات ہی کو

آنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ تو جانتی ہی ہیں۔“

”کیا.....؟“ سلیم چونک کر بولی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔“

”آپ نہیں جانتیں۔“ توخیر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس مکان کی نگرانی کی

جاری ہے۔ کل رات بھر یہاں کا مشہور جاسوس فریدی ایک دیوانے کے بھیس میں سامنے والی

چائے کی دوکان کے نیچے پڑا رہا۔“

”ارے ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔“ سلیم خوفزدہ آواز میں بولی۔

”اور اس وقت بھی کوئی نہ کوئی موجود ضرور ہوگا۔ اسی لئے مجھے ڈاڑھی لگا کر آنا پڑا۔“

”آپ نے یہ بہت ہی کارآمد اطلاع دی۔ شکریہ۔“

”میں استاد کی موت کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں..... ادہ..... اب

میں اجازت چاہتا ہوں۔“

موس کیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اچانک ایک سہارا مل گیا ہو۔ کلاک نے بارہ بجائے۔ اس کی بیچنی بڑھ گئی۔ ابھی پورے سات گھنٹے ہیں۔ اسے ایک ایک منٹ پہاڑ معلوم ہونے لگا۔ توہر کی دلا دین مسکراہٹ، لہجے کی زماہٹ، تہذیب یافتہ اطوار، وہ سوچنے لگی کہ توہر ضرور کسی ادنیٰ سوسائٹی کا فرد ہے۔ مگر وہ اس گروہ کے چکر میں کیسے پھنس گیا۔ وہ ضرور اس کے ساتھ بہنی چلی جائے گی۔ اس دوران میں اس نے نہ جانے کتنے ہوائی قلعی بنا ڈالے۔ پھر اسے صفدر مرزا یاد آیا۔ جو کچھ دنوں سے اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ذلیل، قاتل، اس کی ناک پر تنفر آمیز شکنیں ابھرا آئیں جب سے وہ اس گروہ میں شامل ہوا تھا، پے در پے مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں۔ پندرہ سال سے ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پارہا تھا۔ مگر پہلے کام کی نوعیت ہی دوسری تھی۔ اس نوٹ بنانے والے جھنجھٹ میں اس کے بھائی کو پھنسانے والا یہی تھا۔ لیکن بھائی صاحب نے آج تک یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا گروہ اتنا منظم ہے اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ بہنی کے کچھ لوگوں کا تذکرہ ضرور ہوا تھا لیکن انہیں وہ معمولی قسم کے بد معاش سمجھی ہوئی تھی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ان میں توہر جیسے ذہن اور پڑھے لکھے آدمی بھی موجود ہیں۔ وہ دن بھر پلنگ پر پڑی اوجھتی رہی۔ غنودگی کے کیف آور دھندلکے میں بار بار توہر کا چہرہ ابھرتا۔ اس کی لودھار مگر مردانہ وقار کی حامل آواز بار بار کانوں میں گونج اٹھتی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ وہ اٹھی اور اپنی بہترین پوشاک نکال کر آئینے کے سامنے پہنچ گئی اور پھر ساڑھے چھ بجے وہ گھر سے روانہ ہو گئی۔ آرکچو کے ہال میں داخل ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک بیرا اسے اپنی طرف آنا دکھائی دیا۔

”میم صاحب اس طرف.....!“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
 سلیم اس کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ ایک کیمین کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ سلیم پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئی۔ توہر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔
 ”مجھے شاید کچھ دیر ہو گئی۔“

”نہیں تو۔“ سلیم نے مسکرا کر کہا۔ ”ٹھیک سات بجے ہیں۔“
 سلیم بیٹھ گئی۔ توہر نے باہر کھڑے ہوئے بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ سلیم اسے

”چائے تو پی لیجئے۔“

”نہیں..... آپ کو تھوڑی تکلیف دوں گا۔ آج شام مجھ سے آرکچو میں ملے۔ چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ یہاں میزاز زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں اور ہاں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں آپ کے رکھ رکھاؤ سے یہ نہ ظاہر ہونے پائے کہ آپ خفیہ پولیس والوں کی مصروفیات واقف ہیں۔ اگر میں نے حالات درگروں دیکھے تو آپ کو نکال لے چلوں گا۔ ایک بات اور یہ کہ بقیہ ساتھیوں کو ابھی میرے متعلق علم نہ ہونے پائے۔ شام کو گفتگو کرنے کے بعد اگر اس کی ضرورت سمجھی گئی تو انہیں مطلع کر دیا جائے گا..... ورنہ نہیں۔“ توہر خاموش ہو گیا۔ پھر معنی ڈاڑھی چہرے پر لگائی اور ہیٹ لیتا ہوا بولا۔ ”بھولے گا نہیں..... شام سات بجے آرکچو میں۔“
 ”بہت اچھا..... میں ضرور آؤں گی۔“

وہ باہر نکل گیا۔ سلیم کھڑکی سے اسے دیکھتی رہی۔ چلنے کا انداز کتنا پروقار تھا۔ اس نے سہا اور دیکھا کہ دفعتاً ایک دہلا پتلا آدمی ایک کینے سے نکلا اور توہر کا پیچھا کرنے لگا۔ سلیم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لیکن توہر..... وہ سڑک کے کنارے ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ سلیم بے اختیار مسکرا پڑی۔ ”کتنا چالاک ہے“ سلیم نے آہستہ سے کہا اور کھڑکی کا پردہ گرا دیا۔ غسل خانہ سے واپس آ کر اس نے چوکیدار کو بلوایا۔

”ارے..... وہ چار نمبر والارات کو آیا یا نہیں؟“ اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

”ہاں بی بی جی..... وہ دو بجے رات آیا تھا..... اور چار بجے واپس چلا گیا۔“

”ہونہ..... اچھا تم جاؤ۔“ سلیم نے کہا۔

چوکیدار چلا گیا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آخر یہ کرایہ دار کون ہے۔ اتنی پراسرار حرکتوں کا مطلب..... آخر کس طرح اس کا پتہ لگایا جائے۔ جب اس کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہی ہے تو وہ آتا ہی نہیں۔ کیا کیا جائے.....؟ سلیم نے ناشتہ کیا اور دیر تک اس عجیب و غریب کرایہ دار کے متعلق سوچتی رہی۔ آخر وہ کون ہے کیا اس نے بھاری جرم کیا ہے کیا وہی تو اس کے بھائی کا قاتل نہیں۔ پھر اسے توہر کا خیال آیا..... کس صفائی سے اس نے بھیس بدل رکھا تھا اور کتنا چالاک تھا۔ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اتنا تجربہ کار..... اس نے اس کی موجودگی میں ایک سکون

تو وہ کار آج تک نہ مل سکی۔“ تویر نے کہا۔

”یہ معلوم وہ آدمی کون تھا اور اس کار کو کہاں لے گیا۔“

”ساری مصیبتیں محض صفدر مرزا کی وجہ سے نازل ہوئیں۔ استاد کو اسے گروہ میں شامل نہ

کرنا چاہئے تھا۔“

”کیوں..... اس کی وجہ سے کیوں.....؟“

”اس لئے کہ ایک آدمی رنگون ہی سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔“ تویر نے کہا۔

”کون.....؟“ سلیمہ چونک کر بولی۔

”وہی آپ کا پراسرار کرایہ دار۔“ تویر نے کہا۔

سلیمہ اچھل پڑی۔

”لیکن گھبراہٹ نہیں۔“ تویر نے کہا۔ ”اب اس کا وقت قریب آ گیا ہے۔“

”وہ..... آخر ہے کون؟“

”ابھی بتاتا ہوں..... ہاں وہ گنگولی کا معاملہ کیا تھا.....؟“

”ارے آپ آخر کیا کیا جانتے ہیں۔“ سلیمہ حیرت سے بولی۔

”محض انہی معلومات اور اسی صلاحیت کی بناء پر فریدی سے ٹکرانے کا ارادہ کیا ہے۔“ تویر

مکرا کر بولا۔

”گنگولی کا معاملہ بھی ایک معمہ ہے۔ وہ بھائی صاحب کی کمرے میں گیا اور پھر واپس نہیں لوٹا۔“

تویر مکرا کر لگا۔

”یہ بھی آپ کے کرایہ دار ہی کی ایک معمولی سی بازی گری تھی۔“

”یعنی..... آخر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ وہ ہے کون؟“

”وہی جو نوٹوں سے بھری ہوئی کار لے اڑا..... وہی جو کاشانہ شمشیر سے سعید کی بیوی کو

ٹال لے گیا۔“

”یعنی کہ..... وہ.....؟“ سلیمہ ہکلائی۔

”جی ہاں..... تو شمشیر بہادر۔“ تویر نے کہا۔ ”صفدر سے اپنا انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔“

بہت غور سے دیکھ رہی تھی، تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد تویر نے پوچھا۔ ”میں
کے حادثے کے متعلق تفصیل کے ساتھ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی معلومات سے آپ کے بیان
مقابلہ کرنا ہے۔“

”بھائی صاحب نے بنک کا دروازہ کھول دیا۔“ سلیمہ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کر دیا۔
”صفدر مرزا اور دوسرے آدمی جعلی نوٹوں سے بھری ہوئی کار لے کر پہنچے۔ لیکن اس وقت اس
رفت زیادہ ہونے کی وجہ سے موقع نہیں تھا لہذا وہ کار ایک طرف کھڑی کر کے ادھر ادھر
ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دفعتاً ایک آدمی اس کار کو لے بھاگا۔ صفدر اور اس کے ساتھی گھبرا
بمشل تمام وہ لوگ ایک دوسری کار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے اس کار
کرنا شروع کر دیا۔ دلاور پور تک وہ اس کا تعاقب کرتے رہے۔ پھر اچانک معلوم نہیں اس کار
زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ صفدر وغیرہ اس آدمی کو ڈھونڈتے ہوئے سعید نامی ایک زمیندار
کے یہاں گھس گئے۔ وہاں انہیں کچھ شبہ ہوا اور وہ معمولی پوچھ گچھ کر کے لوٹ آئے۔ چونکہ
انہیں شبہ ہو چکا تھا اس لئے گھات میں لگے رہے۔ وہ آدمی دراصل وہیں تھا۔ جب یہ لوگ دوبارہ
اس گھر میں گئے تو وہ نکل کر بھاگا۔ یہ سب اتنی خاموشی سے ہوا کہ سعید اور اس کی بیوی کو خبر تک
نہ ہو سکی۔ وہ بھاگ رہا تھا اور یہ لوگ اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ صفدر مرزا کے ہمراہیوں میں اس
کا جڑواں بھائی انور مرزا بھی تھا۔ اگر آپ دونوں کو ایک جگہ دیکھ لیتے تو آپ یہ اندازہ نہ لگائے
کہ کون صفدر ہے اور کون انور۔ کچھ ایسی مشابہت تھی دونوں میں۔ انور مرزا دوڑتے وقت اپنے
ہمراہیوں سے کچھ آگے نکل گیا۔ دفعتاً صفدر مرزا نے اس بھاگتے ہوئے آدمی کو چا تو کھینچ مارا۔
اتفاقاً انور مرزا درمیان میں آ گیا۔ اس کے گرتے ہی ان لوگوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ یہ اسے
دیکھنے میں لگ گئے اور وہ آدمی غائب ہو گیا۔“

”اسکی بعد کے حالات مجھے معلوم ہو چکے ہیں۔“ تویر بولا۔ ”صفدر نے سعید کو چھوڑ کر ایک
بھاری غلطی کی۔ پولیس تو یوں بھی اس کی تلاش میں تھی، اسے تو ٹھکانے ہی لگا دینا چاہئے تھا۔“

”یعنی وہ ایک اور قتل کرتا۔“ سلیمہ نے کراہت سے کہا۔

”قتل و غارت گری تو مجھے بھی پسند نہیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔“

”تو کیا..... کچ کچ وہ بچ گیا تھا۔“

”جی ہاں۔“

سلیمہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”تو وہ کسی وقت بھی پولیس کو اس کی اطلاع دے سکتا ہے۔“

”آپ گھبرا ئے نہیں..... جب تک صفدر بالکل اس کے قابو میں نہ آ جائے گا وہ

کرے گا۔ شاید اسے ڈر ہے کہ پھر صفدر اسے دھوکہ دے کر کہیں اور فرار نہ ہو جائے۔“

”مگر آپ کی معلومات کی داد دینی پڑتی ہے ایک ہی دن میں.....!“ سلیمہ نے کہا۔

”ابھی کیا دیکھا ہے آپ نے..... شاید فریدی کی موت مجھے یہاں لے آئی ہے۔“

”مگر میں تمہیں..... ارر..... آپ کو خون نہ کرنے دوں گی۔“

”نہیں..... آپ مجھے تم ہی کہہ کر مخاطب کریں، نجانے کیوں بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔“

سلیمہ شرمائی۔ تویر اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے قربان ہو جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

”آپ ان سب معاملات کو چھوڑیے مجھے کسی طرح ان خطرات سے نکال لے چلے۔“

”بہت پریشان ہوں۔“

”وہ تو آپ چلیں ہی گئی میرے ساتھ۔ لیکن میں ان نوٹوں کو پولیس کے قبضے میں

جانے دوں گا۔ میں انہیں شمشیر سے اگوا کر ہی رہوں گا۔“

”اچھا تو آج رات کو صفدر مرزا کو بلوا لیجئے گا۔ میں تقریباً ایک بجے آؤں گا۔ آج کا

شمشیر کا فیصلہ کرنا ہے۔“

”تو کیا قتل.....؟“ سلیمہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

”نہیں..... وہ آپ کی جوتیوں کے طفیل بچ جائے گا۔“

”تو پھر کیا کیجئے گا.....؟“

”اس سے سارے نوٹ حاصل کر کے اسے کہیں قید کر دیں گے اور ہم لوگ نکل چلیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”صفدر کو بلوا لیجئے گا۔“ تویر نے کہا۔ ”لیکن ہاں اسے میرے متعلق تو بتا دیجئے۔“

شمشیر کا تذکرہ اس وقت تک نہ آنے پائے جب تک کہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ

جلد بازی سے کام لے اور سارا کھیل بگڑ جائے وہ کچھ بیوقوف قسم کا آدمی ہے۔“

”بہت اچھا..... تو پھر میں ایک بجے آپ کا انتظار کروں گی۔ لیکن دیکھئے اپنے وعدے

سے پھرے گا نہیں۔ اب مجھ میں لاشیں دیکھنے کی تاب نہیں رہ گئی۔“

اندھیرا.... اجالا

تویر، صفدر اور سلیمہ آہستہ آہستہ کمرہ نمبر ۳ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کرایہ دار ابھی تک

لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ تویر نے کنبیوں کا ایک لچھا نکالا اور یکے بعد دیگرے کنبیاں لگانے لگا۔ ایک

کنبی سے تالا کھل گیا۔

”دیکھئے.....!“ تویر نے سلیمہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ہم لوگ اندر جاتے ہیں۔ آپ تالا لگا

کر اپنے کمرے میں چلی جائیے۔“

”نہیں..... میں بھی اندر ہی چلوں گی۔“

”تو پھر کام ہو چکا۔“ تویر نے جھلا کر کہا۔ ”وہ تالا کھلا دیکھ کر اٹنے ہی پیر واپس چلا جائے گا۔“

”تویر ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ صفدر بولا۔

”اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو.....؟“

”تو آپ کی موجودگی اس گڑبڑ کو روک دے گی؟“ تویر ہنس کر بولا۔

”دیکھئے..... یہ نہیں۔“ سلیمہ چل کر بولی۔

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ کیجئے۔“ تویر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”وہ دونوں اندر چلے گئے اور سلیمہ باہر سے تالا لگا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر اندھیرا

تھا۔ تویر نے ٹارچ جلائی۔

”نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ صفدر تیز لہجے میں بولا۔
 ”فریدی پر چاقو سے حملہ کر کے بچ نکلنا آسان کام نہیں ہے صفدر صاحب۔“ تویر نے
 ہتھول کارخ صفدر کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”دھوکا..... دھوکا۔“ صفدر غصے میں چیخا۔ ”کینیسیلہ نے غداری کی۔“

”نہیں..... وہ غریب خود بھی دھوکا کھا گئی۔ وہ اس وقت سرجنٹ حمید اور جگدیش کے قبضے
 میں ہو گئی اور تمہارے سارے گروے، جو اس عمارت میں موجود ہیں تمہاری ہی طرح حیرت سے
 ایک ایک کا منہ تنک رہے ہوں گے۔“

شمشیر بہادر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

فریدی نے اپنے ہونٹ اور ناک پر چپکے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے نوچنے شروع کر دیئے۔
 نور کا میک اپ ختم ہو چکا تھا اور فریدی اپنی صحیح شکل و صورت میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دفعتاً
 دروازے پر دستک ہوئی۔ فریدی پستول کی نال صفدر کی طرف کئے ہوئے دروازے کے قریب
 آیا اور چینی گرا دی۔ جگدیش اور حمید سیلہ کو پکڑے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

”حمید صفدر مرزا کے ہتھکڑیاں لگا دو۔“ فریدی نے کہا۔

حمید نے آگے بڑھ کر صفدر مرزا کے ہتھکڑیاں لگا دیں۔

”سیلہ تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی۔“ فریدی مسکرایا۔

”آج زندگی میں میں نے پہلی بار دوہرا بھیس بدلا۔ جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ اگر
 انہیں دھوکا نہ دیتا تو صفدر میاں پر ہاتھ پڑنا ہی مشکل تھا اور صفدر مرزا تم سنو..... کل رات
 اٹانہ شمشیر میں شمشیر بہادر نہیں، میں ہی تھا۔ گھبراہٹ میں تم نے وہیں اقبال جرم کر لیا اور کل
 مارات کو میں نے صدر دروازے کے سامنے والی چائے کی دکان کے نیچے پڑے پڑے شمشیر
 اور کو بھی دیکھا تھا اور سیلہ تم ڈرو نہیں۔ میں نے تویر کے بھیس میں جو وعدہ تم سے کیا تھا اسے
 رو پورا کر دیا گا۔ تم بچا لی جاؤ گی۔ لیکن اس کے لئے تمہیں گواہ بننا پڑے گا اور تم شمشیر بہادر،
 اسے تو یہ مشہور کر رکھا تھا کہ تمہارا کوئی وارث ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ شمشیر نے کہا۔ ”اس وقت واقعی مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ تو اچانک مجھے معلوم

”میرا خیال ہے کہ ہم اس پلنگ کے نیچے چھپ جائیں۔“ تویر نے کہا۔ ”اس کے چار
 طرف لگی ہوئی چادر ہمیں اچھی طرح چھپالے گی۔“
 دونوں پلنگ کے نیچے چھپ گئے۔

کلاک نے دو بجائے اور تھوڑی دیر بعد برآمدے میں پیروں کی آہٹ ہوئی۔ تاہم
 کئی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولا گیا۔ پھر بند کر کے چٹنی چڑھا دی گئی اور پھر کمر
 بلب روشن ہو گیا۔ صفدر نے چار پائی کی چادر ذرا سی کھسکائی۔ ایک بھاری بھر کم آدمی ان کی طرف
 پشت کئے کھڑا تھا۔ تویر آہستہ سے پلنگ کے نیچے سے نکلا اور پستول کی نال اس کی گردن
 لگادی۔ وہ چونک پڑا۔

”خبردار جنش نہ ہو۔ ورنہ لیبی دب جائے گی۔“ تویر آہستہ سے بولا۔ صفدر مرزا بھی
 اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی کے جسم پر خوف کی وجہ سے لرزہ طاری ہو گیا۔

”صفدر یہ لو۔“ تویر نے ایک پتلی اور مضبوط سی جیب سے نکال کر صفدر کی
 بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”شمشیر بہادر کو نہایت احتیاط سے جکڑ دو اور تم شمشیر بہادر چپ چاپ
 کرسی پر بیٹھ جاؤ..... چلو.....!“

شمشیر بہادر کو کرسی سے جکڑ دیا گیا۔

”وہ کار کہاں ہے شمشیر جی۔“ تویر نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”بتاؤ۔“

”میں نہیں جانتا کون سی کار۔“

”یہ ایسے نہیں بتائے گا۔“ تویر نے جیب سے ہتھکڑیوں کا جوڑا نکالتے ہوئے کہا

میاں صفدر اسے اپنے ہاتھوں میں پہن لو۔“

”کیا مطلب.....؟“ صفدر چونک کر بولا۔

”جلدی کرو..... میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ تویر نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

آیا۔ یہاں ایک کانڈ پر بے شمار نوٹوں کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ سلیم نے کس مقصد سے یہ نوٹوں کی کھڑکی کی تھی۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں یہ اپنا شبہ ظاہر کر کے اس کی پبلیٹی نہ کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو صفدر مرزا جو چھپ کر نوٹوں والی کار تلاش کر رہا تھا اس شہر ہی سے فرار ہو جاتا اور میں اس سے انتقام نہ لے پاتا اور گنگولی دلاور پور کے ایک ماہی گیر کے جھونپڑے میں اب بھی موجود ہے۔

”تو تم نے اسے بند کر رکھا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں وہ اپنی خوشی سے وہاں مقیم ہے، لیکن میں نے اسے اس بات کا یقین دلادیا تھا کہ پولیس کو اس پر شبہ ہے اور اس کا وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکا ہے۔“

”بہر حال تمہیں بھی اپنے کو قیدی ہی سمجھنا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ تم عدالت سے بری ہو جاؤ۔ تم پر پہلا چارج تو یہ ہے کہ تم نے سلیم کو بیہوشی کی حالت میں سپاٹ چھت پر چھوڑ دیا اور ایک ہی کروٹ اسے نیچے لے آئی۔ دوسرا چارج یہ کہ تم نے جعلی نوٹوں کو فوراً ہی پولیس کے حوالے کر دینے کی بجائے اتنے دنوں تک اپنے قبضے میں رکھا۔ تیسرا چارج یہ کہ تم نے ایک بے گناہ شہری کو دھوکہ دے کر اتنے عرصہ تک نظر بند رکھا۔“

شمسیر بہادر خاموش تھا۔

”ہمیاں حمید اور بھائی جگدیش۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”دیکھا تم نے آخر سعید اور اس کی بیٹی بے دارغ جھوٹ گئے۔“

تمام شد

ہوا کہ میرے ایک سوتیلے چچا بچپن ہی میں ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے تھے۔ میں نے یہ شروع کر دیا تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکے ہیں لیکن ان کے دولڑکے صفدر مرزا اور انور مرزا اب رنگون میں موجود ہیں۔ رنگون پہنچا۔ خفیہ طور پر ان کا پتہ لگایا۔ صفدر سے دوستی کر کے اس کے چلن کا پتہ لگانا شروع کیا۔ کسی طرح اس کو میری اصلیت معلوم ہو گئی۔ اس نے جلد سے جلد ریاست کا مالک بن جانے کے لالچ میں مجھے قتل کرنا چاہا۔ مجھے مچھلی کا شکار کھلانے کے بہانے لے گیا اور کشتی پر مجھے گولی کا نشانہ بنایا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو دریا کے کنارے ایک گاؤں میں پڑا پایا۔ گولی میرے بازو میں لگی تھی، زندگی تھی، جو ڈوب کر نہیں مرا میں صفدر سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اپنی موت کی خبر میں نے ہی اخباروں میں شائع کرانی تھی۔ صفدر کا پیچھا کرتا ہوا میں ہندوستان آیا۔ یہاں آ کر اس نے سلیم سے ساز باز کی اور جلی نر بنانے لگا۔

”اس کے آگے مجھے معلوم ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ سلیم کیسے مرا.....؟“

”سلیم بنک کا دروازہ کھول چکا تھا۔ نوٹوں والی کار بھی آچکی تھی۔ اتفاق سے میں شہر ہی سے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ لوگ کامیاب نہ ہو جائیں۔ لہذا میں نے جلدی صاحب کو گنگولی کی طرف سے فون کیا اور آپ کو سلیم کی طرف سے اور خطرے کا الارم بجا گھبراہٹ میں سلیم کو کھینچتا ہوا اوپر لے گیا۔ راستے میں اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں نے جلدی میں اسے وہیں چھت پر لٹا دیا اور خود نیچے بھاگا۔ دیر ہوتی جا رہی تھی۔ نہ تو الارم سن کر گنگولی ہی نیچے آیا تھا اور پولیس کا ہی پتہ تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کار لے کر فرار ہو جاؤں۔ کار اب بھی دلاور میں محفوظ ہے..... پھر میں.....!“

”گنگولی کو کیا ہوا.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”میں نے اسے چھپا رکھا ہے۔“

”کیوں.....؟“

”میں نے مجبوراً ایسا کیا تھا۔ گنگولی سلیم کی موت کے بعد اس کے کمرے کی تلاش کی

جاسوسی دنیا نمبر 10

پکنک

احمقوں کا چکر

صبح کی غم اور تنگ چادر فضا پر محیط تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ سرسبز پتوں پر اوس کی جھللاتی ہوئی بوندیں لرز رہی تھیں۔ آسمان صاف تھا۔ نیلا بے کراں آسمان اور افق میں گہرے رنگوں کی چمک دار دھاریاں۔

فریدی کے پائیں باغ میں سرجنٹ حمید ایک کتاب کی مدد سے قدیم ہندو تہذیب کی مختلف ورزشوں کی مشق کر رہا تھا۔ کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر گہرے گہرے سانس لیتا اور کبھی پاتھی مار کر بیٹھ جاتا۔ پھر کتاب میں ترکیبیں دیکھ کر طرح طرح کے منہ بناتا اور پیٹ چپکانے کی مشق کرتا۔ فریدی برآمدے میں بیٹھا شیو کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کی حماقتوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے حمید سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن توازن قائم نہ رکھ سکے کی بناء پر پھر گر پڑا۔ وہ اپنی گردن سہلانے لگا۔ شاید کوئی رگ چمک گئی تھی۔ پھر اس نے دوبارہ سر کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے کتاب کے ورق الٹنے شروع کر دیئے۔ اب وہ پھر پاتھی مار کر بیٹھ گیا اور اپنی ٹانگیں اٹھا کر گردن پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک ٹانگ تو اس نے کسی نہ کسی طرح رکھ لی لیکن دوسری ٹانگ رکھتے ہی وہ بُری طرح چیخ کر لڑھک گیا۔ دونوں ٹانگیں گردن میں بھنسی ہوئی تھیں اور وہ خود چپت پڑا بُری طرح چیخ رہا تھا۔ فریدی شیو کر کے اٹھا۔ حمید کو اس حال میں دیکھ کر چند لمحوں کے لئے مسکراتا رہا پھر اندر چلا گیا۔ حمید دراصل چیخ چیخ کر اسے مدد کے لئے بلارہا تھا

(مکمل ناول)

لیکن اس کی بے رخی دیکھ کر اسے تاؤ آ گیا اور دو تین جھلائے ہوئے جھکوں نے اسے اس نجات دلا دی۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے درزش کا کتاب ایک طرف رکھی۔ بندوق میں کارتوس چڑھایا اور نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ کتاب کے پر نچے اڑ گئے۔

”کیا اودھم مچا رکھی ہے۔“ فریدی نے برآمدے میں آ کر کہا۔

”آپ سے مطلب۔“ حمید نے کہا اور منہ بتائے ہوئے اندر چلا گیا۔

”آخر تمہارا بچپنا کب رخصت ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”جب جوانی آئے گی۔“

”اچھا..... اچھا..... جلدی کیجئے..... وہ لوگ آرہے ہوں گے۔“

”میں کہیں نہ جاؤں گا۔“

”کیا کہا.....؟“ فریدی اسے گھور کر بولا۔ ”پھر تم نے شہناز وغیرہ سے وعدہ کیوں کر لیا تھا۔“

”کر لیا ہوگا۔“

”خیر میں تو بہر حال جاؤں گا۔ پکنک ہو کر رہے گی۔ اچھا ہے تم نہ جاؤ..... تمہاری وجہ سے بڑی بے لطفی ہو جائے گی۔“

”جی ہاں..... بہتر ہے..... شہناز بھی نہ جائے گی۔“ حمید نے کہا۔

”یہ تم سے کس احق نے کہہ دیا۔ میں اسے کھینچ کر لے جاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”آنا“

یہی دیکھتا ہے کہ وہ تمہارا کہنا مانتی ہے یا میرا۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا اور غسل خانے میں گھس گیا۔

فریدی لباس تبدیل کر کے باورچی کو کچھ ہدایات دینے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد کپاؤٹھ میں ایک کار آ کر رکی۔ شہناز اور اس کی دو سہیلیاں سیلا ٹریا اور

اشرف ثریا کا بھائی کار سے اتر کر کونچھی میں داخل ہوئے۔

”آئیے..... آئیے میں انتظار ہی کر رہا تھا۔“ فریدی نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں دیر تو نہیں ہوئی۔“ شہناز بولی۔

”آپ تو ٹھیک وقت پر پہنچیں لیکن شاید ہمیں دیر ہو جائے۔“

”کیوں.....؟“ شہناز نے پوچھا۔

”حمید کا اسکر یو پھر کچھ ڈھیلا ہو گیا ہے۔“ فریدی نے اپنی کپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ شہناز ہنس کر بولی۔ اور اُس کی دونوں سہیلیاں اسے

شرارت آمیز نظروں سے گھورنے لگیں۔

فریدی انہیں لے کر کھانے کے کمرے میں آیا جہاں بڑی میز پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔

”ارے اس کی کیوں تکلیف کی۔“ اشرف نے کہا۔

”تکلیف..... ابھی تک تو کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”اور حمید صاحب۔“ ثریا بولی۔

”ابھی وہ غسل خانے ہی میں تشریف فرما ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہم لوگ شروع کرتے

ہیں وہ آ ہی جائیں گے۔“

”پھر بھی انتظار کر لینے میں کیا ہرج ہے۔“ شہناز بولی۔

”تو آپ کیجئے انتظار..... ہم لوگ تو شروع کر رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ سب لوگ

ہنسنے لگے اور شہناز نے شرما کر سر جھکا لیا۔

”میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ ایسی ہی حالت میں سیدھا رہتا ہے جب اس کے ساتھ

لاپرواہی برتی جائے۔“ فریدی نے کہا۔ ”دور نہ دوسری صورت میں تو مزاج ہی نہیں ملتے۔“

”بہر حال شہناز..... آپ کے مشورہ پر عمل نہ کر سکیں گی۔“ ثریا بولی۔

”خیر تو آپ زچ ہوں گی مجھے کیا کرنا ہے۔“ فریدی نے کہا اور ناشتہ شروع کر دیا۔

وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ کپاؤٹھ میں کار اشارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

”لیجئے نکل گیا ہاتھ سے۔“ فریدی نے چونک کر کہا۔ ”عجیب خطی آدمی ہے۔ بعض اوقات

مجھے سچ سچ اس پر غصہ آنے لگتا ہے۔“

شہناز کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آئی۔ حمید فریدی کی کار پھانک کے باہر لے جا چکا

تھا۔ وہ کچھ مصلحتی ہو کر واپس آ گئی۔

”دیکھا آپ نے۔“ فریدی نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”تو میں کیا کروں۔“ شہناز توری چڑھا کر بولی۔

”اسے آدمی بنائیے..... میں تو تھک کر ہار چکا ہوں۔“

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور شہناز جھینپ گئی۔

”تو اس کا مطلب یہ کہ پلنگ نہ ہو سکے گی۔“ شیلا نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ فریدی بولا۔

”شاید شہناز نہ جائیں۔“ ثریا نے کہا۔

”کیوں.....!“ شہناز ثریا کو گھور کر تیز لہجے میں بولی۔ ”میں کیوں نہ جاؤں گی۔“

”ارے بھی..... اس میں میگزنی کی کیا بات ہے۔“ شیلا ہنس کر بولی۔

ناشتہ کر چکنے کے بعد فریدی نے اپنی رائفل اٹھائی اور ان لوگوں کے ہمراہ برآمدے میں آیا۔

”کیا بتاؤں کارسلے کر چلا گیا۔“ فریدی بولا۔

”کرنا کیا ہے۔“ اشرف نے کہا۔ ”کار ہے تو۔“

سب اشرف کی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

”میں شاید دو سال بعد جھریا کی طرف جا رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”اب تو وہاں دو ایک عمارات بھی بن گئی ہیں۔“ اشرف بولا۔

”عمارتیں.....!“ فریدی چونک کر بولا۔ ”وہ تو ایک بالکل ہی ویران مقام ہے۔“

”ٹھیک جھیل کے سامنے دو ڈاکٹروں نے اپنی تجربہ گاہ بنا رکھی ہے۔ بہت بڑی اور شاندار

عمارت ہے۔ اس سے تقریباً ایک میل کی دوری پر ایک کارخانہ ہے جہاں خیموں اور چھولہ اربوں

کے لئے بانس کے ستون بنائے جاتے ہیں۔“

”تجربہ گاہ کس قسم کی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بہت ہی دلچسپ اور عجیب۔“ اشرف بولا۔ ”انہوں نے بے شمار وحشی درندے پال رکھے ہیں۔“

”وحشی درندے۔“ فریدی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو ابھی کہا تھا

کہ وہ ڈاکٹر ہیں۔ بھلا ڈاکٹروں کا وحشی درندوں سے کیا کام۔“

”وہ ڈاکٹر بھی عجیب ہیں۔“ اشرف نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ کوئی بالکل نئے قسم

کے تجربات کر رہے ہیں۔“

”کس سلسلے میں.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وضاحت کے ساتھ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن اتنا سنا ہے کہ وہ آدمی کی کاپیا پلٹ کر دیتے ہیں۔“

”چیز بڑی دلچسپ ہے۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ ان کے سائن بورڈ ہیں۔“ اشرف ہنستا ہوا بولا۔

”ایک سائن بورڈ پر لکھا ہے بزدلوں کو شیر بنانے کا کارخانہ، خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔

لیکن دوسرا سائن بورڈ تو بالکل ہی احمقانہ ہے۔ اس پر لکھا ہے یہاں ٹوٹے پھوٹے آدمیوں کی

مرمت کی جاتی ہے۔“

سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے لیکن فریدی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

”آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔“ فریدی تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔

”خود چل کر دیکھ لیجئے گا۔“ اشرف نے کہا۔

”ایسے موقع پر حمید صاحب کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوگی۔“ ثریا بولی۔

”مجھے امید ہے کہ اس سے جھریالی پر ضرور ملاقات ہوگی۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا کہہ کر گئے ہیں۔“ شہناز نے پوچھا۔

”کہہ کر تو نہیں گیا..... لیکن انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ مچھلیوں کے شکار کا سامان

مکھڑو موجود نہیں تھا۔“

”تب تو وہ یقیناً وہیں گئے ہیں۔ لیکن اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ضرورت تو وہی جانے۔ اسے دوسروں کو تنگ کرنے میں لطف آتا ہے۔ وہ محض اسی لئے

کارسلے کر چلا گیا کہ میں تھوڑی دیر تک جھنجھلاہٹوں کا شکار رہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”عجیب آدمی ہیں۔“ ثریا بولی۔

”میرا ہی جگہ ہے کہ اس کے نخرے سنبھالتا ہوں۔“ فریدی شہناز کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔“

جنی پلانی شروع کی اور ایک بڑی سی مچھلی کو پانی سے کھینچ کر باہر نکال لیا۔

”بہت اچھے..... بہت اچھے۔“ ثریا اور شیلہ تالیاں بجاتی ہوئی جینیں۔

”اور وہ تجربہ گاہ۔“ فریدی اشرف کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”ان درختوں کے پیچھے۔“ اشرف نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔“ فریدی نے بلند آواز میں پوچھا۔

”ہم سب پہلے اس عجیب و غریب تجربہ گاہ کو دیکھیں گے۔“ عورتوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”ضرور دیکھئے۔“ حمید اچانک بولا۔ ”قریب قریب آپ سبھی کافی ٹوٹے پھوٹے ہیں۔“

”تو کیا تم اسے دیکھ آئے ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”دیکھنا کیا..... میں نے تو اپنا نام بھی رجسٹر میں درج کرادیا ہے۔ ایک ماہ بعد میرا نمبر

اور بارہ انگھوں کا بہت اچھا شکار ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وحشی درندے بھی مل جاتے ہیں جن! آئے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”شیر بننے کا ارادہ ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”یعنی.....؟“

”لکچر کا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے دونوں پر لے سرے کے احمق ہیں۔“

”انہیں ڈاکٹروں کا تذکرہ کر رہے ہو۔“

”جی ہاں..... ایک انگلینڈ ریٹرن ہے اور دوسرا جرمنی سے ڈگری لے کر آیا ہے۔“

”خیر تو سب ہے لیکن آپ وہاں سے اس طرح بھاگے کیوں؟“ شہناز نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”تاکہ آپ لوگوں کے کھانے پینے کا معقول انتظام کر سکوں۔ میرے خیال سے اب آپ

اس مچھلی کو ادھیڑنا شروع کر دیجئے۔“ حمید نے کہا۔

”مچھلی تو بعد میں ادھیڑ لی جائے گی۔“ ثریا بولی۔ ”شہناز کا خیال پہلے آپ ہی کو ادھیڑنے

کا ہے۔“

حمید نے شہناز کی طرف ایسی بے بسی اور مسکینیت سے دیکھا کہ اسے بیساختہ ہنسی آ گئی۔

”آپ کا خیال غلط ہے۔“ حمید نے ثریا سے کہا۔ ”آپ خواہ مخواہ لوگوں کو بہکاتی پھرتی ہیں۔“

”تو یہ آپ شہناز کو کیوں سنا رہے ہیں۔“ ثریا ہنس کر بولی۔

شہناز نے اسے گھور کر دیکھا اور فریدی مسکرانے لگا۔

”میں انہیں اس لئے سنا رہا ہوں کہ اب بھی اپنا فیصلہ بدل دیں۔“ فریدی بولا اور شہناز

جھینپ گئی۔

”اب زیادہ نہ جھینڑیے، ورنہ یہ اس کی کسریہ صاحب سے نکال لیں گی۔“ شیلہ نے کہا

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ لوگ جھریالی پہنچ گئے۔ یہ ایک پر فضا مقام ہے بلکہ اگر اسے شکار

کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تقریباً دو میل کے رقبے میں ایک خوبصورت جھیل پھیلی ہوئی ہے ج

کے چاروں طرف سرسبز جنگل ہیں جو زیادہ گھنے نہیں دراصل اسی جھیل ہی کا نام جھریالی ہے۔

کے ساتھ ہی ساتھ اس کے قرب و جوار کا علاقہ بھی اسی نام سے پکارا جانے لگا ہے۔ یہاں ہر

اور بارہ انگھوں کا بہت اچھا شکار ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وحشی درندے بھی مل جاتے ہیں جن! آئے گا۔“

تیندوا تو بہت ہی عام ہے جھیل میں مچھلیوں کا اچھا خاصا شکار ہوتا ہے۔“

تھوڑی دور پر فریدی کو اس کی کار کھڑی دکھائی دی۔

”لیکن حمید کہاں گیا۔“ فریدی نے کہا۔

”کہیں ہوں گے۔“ شہناز لا پرواہی سے بولی۔

دفعۃ قریب کی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی۔ حمید نے سر نکال کر باہر دیکھا اور پھر اسی ط

پیچھے ہٹ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

سب لوگ جھاڑیوں میں گھس گئے۔ حمید نے مچھلی پھسانے کی ڈوریں جگہ جگہ لگا رکھی

اور ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔

ان لوگوں کے وہاں پہنچ جانے پر بھی اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

”منانے والوں کو دیکھ کر لوگ روٹھا ہی کرتے ہیں۔“ ثریا ہنس کر بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ شیلہ بولی۔

”فریدی صاحب اور شہناز جیسے قدردانوں کی موجودگی بھلا کسے نصیب ہوگی۔“

حمید کے رویہ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہرا ہو گیا ہو۔ دفعۃ اس نے ایک

”اچھا تو کون کون چل رہا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

سب کے سب تیار ہو گئے۔

”کہاں بیکار وقت برباد کرنے جاؤ گی۔“ حمید نے آہستہ سے شہناز سے کہا۔

”آپ سے مطلب.....!“ شہناز نے کہا اور فریدی کے ساتھ ہوئی۔

حمید بدستور بیضا جی خیاں گھماتا رہا۔

اشرف فریدی وغیرہ کی رہنمائی کر رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے وہ

ایک عمارت کی چار دیواری کے قریب پہنچے۔ پھانگ پر ایک نیپالی پہرے دار بیڑی پی رہا تھا ان لوگوں کو پھانگ کی طرف آتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”کدھر جانا مانگتا۔“ وہ بولا۔

”اندر..... ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اچھا ٹھہرو..... ہم جا کر بولتا۔“ پہرے دار نے کہا اور اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لوٹا۔

”چلو.....!“

”فرمائیے..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ہمیں آپ کا سائن بورڈ یہاں تک کھینچ لایا ہے۔“

”اوہ.....!“ ڈاکٹر ہنستا ہوا بولا۔ ”یہ ہندوستان ہے اگر ہم اس طرح کی حرکت نہ کریں

کوئی ہماری طرف دھیان ہی نہ دے۔“

”مگر یہاں اس ویرانے میں تو بہت کم لوگ آتے ہوں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ کا خیال درست ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”لیکن ابھی ہم زیادہ بھیڑ چاہتے بھی نہیں ہیں۔“

”ایسی صورت میں یہاں اس قسم کے سائن بورڈ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔“ فریدی نے

کہ بولا۔ ”ظاہر ہے کہ آپ نے یہ محض لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے لگائے ہیں۔“

”ان بورڈوں کا صرف یہی مقصد نہیں ہے۔“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”یہ بھی طبی دنیا میں ایک

نئے قسم کا تجربہ ہے۔“

احقوں کا چکر

”تجربہ.....“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر پرسکون لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو میں وضاحت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”مجھے خوشی ہوگی۔“ فریدی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھی بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ امراض کی صحیح تشخیص کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔“

”جی ہاں.....!“ فریدی نے جواب دیا۔

”ہماری تھموری یہ ہے کہ اگر جسم کے سارے اعضاء تھوڑی دیر کے لئے ڈھیلے ہو جائیں

یعنی ان پر کسی قسم کا زور نہ پڑے تو ایسی حالت میں مرض کی تشخیص میں کوئی خاص دقت نہیں

ہوتی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت پیدا کس طرح کی جائے۔ ہم لوگ انسانی فطرت

اور اس کی جذباتی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرف خوشی ہی کا

جذبہ ایسا ہے جو انسان کے جسم اور ذہن کو ایسی حالت میں لے آتا ہے جسے ہم سکون تو نہیں کہہ

سکتے البتہ اس سے ایک ملتی جلتی حالت ہے۔ جسم میں اعضاء ایک قسم کا ڈھیلا پن محسوس کرتے

ہیں یعنی ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑتا۔ لہذا ہم مریضوں کا طبی معائنہ کرنے سے قبل انہیں

خیالات کے تحت ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارا سائن بورڈ دیکھتے ہی آپ کو ہنسی

آئی ہوگی۔ لوگوں کو ہنسانے کے اور بھی بہتر طریقے ہم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

کارٹون دکھانا مذاحیرہ ریکارڈ سنانا، مسخروں کی نقلیں دکھانا وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان سے اس طرح کے

بے ڈھنگے سوالات کرتے ہیں کہ انہیں بے ساختہ ہنسی آئے۔ مثلاً میں آپ سے یہ پوچھوں کہ

ب آپ بکری کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے تو اس وقت آپ کی کیا عمر تھی تو آپ کو بے ساختہ

ہنسی آجائے گی۔“

”لیکن مجھے افسوس ہے کہ مجھے قطعی ہنسی نہیں آئی۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا اور سب

لہنسنے لگے۔

”محض اس لئے کہ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے لیکن اگر میں انتہائی سنجیدگی کے عالم

میں طبی معائنہ کرتے وقت آپ سے یہی سوال کرتا تو آپ اپنی ہنسی کسی صورت سے نہ روک

سکتے۔“

”ہاں یہ ممکن ہے۔“ فریدی نے کہا۔

آواز۔ وہاں پر کھڑے ہوئے سارے لوگ بوکھلا گئے۔ چیتا بدستور بکرے کی آواز میں چیخے جا رہا تھا۔ دوسرے ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے فریدی کے ساتھی ڈاکٹر کی طرف

گمراہ کر دیکھا۔ فریدی کو میساختہ ہنسی آگئی۔ اس کے ساتھ والے ڈاکٹر نے بھی ہتھکڑیاں لگائیں۔

”دیکھا آپ نے۔“ اس نے فریدی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہم لوگ اپنے مریضوں کو بنانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ سچ بکرا ہے۔“

”بکرا.....!“ فریدی نے متحیر ہو کر دہرایا۔

”جی ہاں ہم نے اس پر چیتے کی کھال چڑھا دی تھی۔“

”بہت خوب۔“ فریدی اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”واقعی آپ لوگوں نے بہت ہی نفسیاتی قسم کے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔“

”اور آپ نے ابھی ہمارا طریقہ علاج تو دیکھا ہی نہیں۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

”اگر آپ اس پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں تو ممنون ہوں گا۔“ فریدی بولا۔

”ضرور ضرور، اس طرف تشریف لائیے۔“ ڈاکٹر نے ایک دروازے میں داخل ہو کر کہا۔

اس کمرے میں چاروں طرف چھوٹے بڑے کتھرے لگے ہوئے تھے جن میں انواع و اقسام کے جنگلی جانور بند تھے۔ ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا بندرتیز رنگا آواز میں چیخا بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کسی ریلوے انجن نے سیٹی دی ہو۔ شہناز وغیرہ سہم لگے۔

”زیستہ نہیں۔“ ڈاکٹر عورتوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اول تو ان میں کوئی درندہ نہیں۔“

”ہرے یہ کراں سب کے کتھرے مقل ہیں۔“

”ہاں تو آپ اس کتھرے میں ایک کتا بھی دیکھ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ آئیر ڈیل ٹیریر ہے نا.....!“ فریدی نے کہا۔

”غالباً آپ کو کتوں سے خاصی دلچسپی ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔“ ڈاکٹر نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد

”ہم لوگ شہر سے ڈکار کھیلنے کی غرض سے آئے ہیں لیکن آپ کا سائن بورڈ دیکھ کر

کچھ بھول گئے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ لوگوں کا کارنامہ واقعی

سناٹا ہے۔ طبی دنیا میں آپ کی یہ تھوڑی یقیناً ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دے گی۔“

”شکریہ.....!“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن ابھی آپ ہمارے طریقہ علاج سے واقف نہیں

”اگر اس سے بھی مستفید ہو سکیں تو اپنی خوش قسمتی سمجھیں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”ضرور..... ضرور.....!“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”آئیے میرے ساتھ۔“

ڈاکٹر اٹھا اسی کے ساتھ فریدی کے ساتھی بھی اٹھ گئے۔ وہ انہیں متعدد کمروں اور

سے گھماتا ہوا ایک دوسری عمارت میں لایا۔ فریدی محسوس کر رہا تھا کہ اس عمارت کے بنوا

ہزاروں روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ جب وہ اس ڈاکٹر کی حماقت آمیز اور بے سرو پا

غور کرتا تو اسے حیرت ہونے لگتی۔ آخر یہ کیا تماشا ہے یہ لوگ یونہی بے مصرف تو اتنا پیہ

نہیں کر رہے ہیں۔ ان حماقتوں کے پردے میں کوئی بہت ہی خطرناک قسم کی سنجیدگی کام

ہے۔ وہ لوگ ایک بہت بڑے کمرے میں آئے یہاں سائنسی تجربات کرنے کے بہت

آلات رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک زندہ چیتا پڑا ہوا تھا جس کے چاروں پیروں

جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے جیڑوں کے گرد ایک تار لپیٹ دیا گیا تھا تاکہ وہ اپنا منہ

نہیں دوسرا ڈاکٹر ایک آلے کی مدد سے اس کے جسم سے خون نکال کر ایک برتن میں اکٹھا

تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر چند لوگ کھڑے تجربے کو حیرت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے

کے حلق سے درد و کرب کی وجہ سے عجیب قسم کی گھٹی گھٹی سی آوازیں نکال رہی تھیں۔“

ہونے کے لئے زور مار رہا تھا۔ لیکن بندش اتنی سخت تھی کہ جنبش کرنا بھی دشوار معلوم

فریدی اپنے ہمراہی ڈاکٹر سے اس کے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً چیتے

چڑھا ہوا تار کھسک کر زمین پر آ رہا اور چیتے نے ایک چیخ ماری۔ مگر چیتے کی چیخ تھی یا بکر

رہنمائی میں جہانگیر کی کوشش کر رہا ہو۔

”کچھ یونہی سی۔“ فریدی بولا۔

”لوہڑی پر اس انجکشن کا اثر عارضی ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں جائے گی۔ یہ وہ نسخہ ہے جو نازی ڈاکٹر نے ایجاد کیا تھا۔ کچھلی جنگ عظیم میں اسے بڑی شدت سے استعمال کیا گیا۔ قریب قریب ہلڑنے والے نازی کو اس قسم کے انجکشن دیئے جاتے تھے۔“

”اوہ.....!“ فریدی کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی۔

”لومڑی سہم جائے گی۔“ اشرف بولا۔

”خیر تو اگر میں اس آئینہ ذیل ٹیبلٹ کو اس لومڑی کے کٹھڑے کے قریب چھوڑ دوں
ہوگا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ٹھیک۔۔۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن ٹھہریے میں آپ کو ایک دلچسپ تماشہ دکھانا، وہ کمرے سے چلا گیا۔ فریدی وغیرہ کٹہروں کے جانور دیکھنے لگے۔

”لیکن ہم نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ ہم اس انجکشن کے ذریعہ بزدلوں کو تالا بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم کئی ایک تجربے اور کر رہے ہیں۔ اس انجکشن کو ذرا کچھ ریزہ کر دیا جائے تو تپ دق کے مریض اس سے اچھے ہو سکتے ہیں۔“

”آپ لوگوں کے کارنامے قابل قدر ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں کبھی آپ لوگوں سے نفلی ملاقات کروں گا۔“

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن لگانے والی سرنگ تھی۔ اس نے کتے کو کٹھرے سے نکال کر لومڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کٹھرے پر جھپٹ پڑا۔ خوفزدہ آوازیں نکالتی ہوئی ایک طرف سمٹ گئی۔ ڈاکٹر نے کتے کو پکڑ کر دوبارہ کٹھرے پر کر دیا اور پھر لومڑی کی ایک ٹانگ پکڑ کر سلاخوں کے باہر کھینچتے ہوئے اس میں انجکشن دے لومڑی نے چیخ مار کر ٹانگ اندر کھینچ لی۔

”یہ میرا کارڈ اور یہ میرے ساتھی کا۔“ ڈاکٹر نے دوطاقاتی کارڈ فریدی کی طرف بڑھاتے دیکھا۔ ”عالمِ آب آپ لوگ شکار کھیلیں گے۔ لیکن کوئی درندہ شاید ہی آپ کو مل سکے۔“

”کیوں.....؟“ فریدی نے حیرت سے پوچھا۔ ”تیندوے تو یہاں بکثرت ملتے ہیں۔“

”کبھی تھے لیکن اب نہیں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”ان نسب کو ہم نے اپنی تجرباتی مہم میں کھپا دیا۔“

”تجرباتی مہم۔“ فریدی نے متعجبانہ انداز میں دہرایا۔

”جی ہاں..... بعض اوقات ہم وحشی درندوں کا خون انسان کے جسم میں ڈال کر اس کی نفسِ خامیاں دور کرتے ہیں۔“

لومڑی تھوڑی دیر تک بیٹھی کانپتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سردی لگ رہی ہے۔ اچانک اس نے آہستہ آہستہ غرانا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی کتا اپنے کسی حریف کو دیکھ کر غراتا ہے۔ ڈاکٹر نے کتے کو دوبارہ کتھرے سے نکالا۔ لومڑی کی غراہٹ اور تیز غرانا اس بار اس کے کتھرے پر جھپٹنے کے بجائے دور کھڑا لومڑی کی طرف گھور رہا تھا۔ ایسا معلوم تھا جیسے وہ کسی شے میں پڑ گیا ہو۔ دفعتاً ڈاکٹر نے لومڑی کا کتھرہ کھول دیا اور وہ کتے پر پڑی۔ کتا شاید اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ لومڑی اس پر پھر حملہ کیا اس ہنگامے میں ثریا وغیرہ کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ڈاکٹر نے ہنسنے لومڑی کو پکڑا اور اسے پھر کتھرے میں دھکیل کر کھڑکی بند کر دی۔ لومڑی بدستور غرائے جارہے کتا چیپ چاپ کتھرے میں چلا گیا۔

”دیکھا آپ نے.....!“ ڈاکٹر فریدی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اوہ.....!“ فریدی نے کہا۔ ”اچھا ڈاکٹر..... اس تکلیف کا بہت بہت شکریہ۔ آپ دکان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں کوئی فرصت کا موقع نکال کر آپ سے ضرور ملوں گا۔“

فریدی وغیرہ ڈاکٹر سے مصافحہ کر کے کمپاؤنڈ سے باہر چلے آئے۔ پھانک سے گزرتے وقت فریدی نے نیپالی چوکیدار کے ہاتھ میں ایک پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

”میرے خیال سے تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔“ شہناز نے راستے میں فریدی سے کہا۔
 ”اس قسم کی ضرورتیں میں ہی سمجھتا ہوں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

فریدی نے سر ہلا دیا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ۔ اسکے ہونے تھے۔ آنکھوں کے حلقے اس طرح تنگ ہو گئے تھے جیسے وہ حال کی یکا چوند سے نظر

یہ لوگ وہاں پہنچے جہاں سرجنٹ حمید مچلیوں کا شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے دو تین کافی قسم کی مچھلیاں شکار کر لی تھیں اور اب گھسی جھاڑیوں کی چھاؤں میں اوندھا لیٹا پائپ پی رہا فریدی کو دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”فرمائیے..... کوئی نئی شرارت۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”جی نہیں..... آپ کیلئے دل چسپی کا مشغلہ اور اپنے لئے ایک مستقل آفت۔“ حمید نے ”کیا مطلب.....؟“ فریدی نے کہا۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ حمید نے آہستہ سے کہا اور پھر عورتوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

لوگوں کے لئے یہ جگہ سب سے بہتر رہے گی۔ یہاں کافی سایہ ہے اور صاف و شفاف زمین مچھلیاں بھی کافی ہیں۔ آپ لوگ اسٹوپ وغیرہ تو ساتھ لائی ہی ہوں گی اور اس کے بعد سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بھوک لگ رہی ہے۔“

ثریا اپنی کار سے ضروری سامان نکال لائی۔ شلا مچھلیاں ادھیڑنے لگی، اشرف گھاٹ لیٹ کر ایک کتاب دیکھنے لگا۔ ثریا اور شہناز اسٹوپ ٹھیک کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

”اگر دو چار بیخ پر بھی مل جائیں تو کیا کہنا۔“ فریدی نے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”گھوم پھر کر دیکھتا ہوں۔“

حمید بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

”کیوں! کیا کہہ رہے تھے۔“ فریدی نے تھوڑی دور چلنے کے بعد پوچھا۔

حمید نے پتلون کی جیب سے ایک ہار نکال کر فریدی کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا۔“ فریدی ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ارے یہ تو ہیروں کا۔“

نہایت عمدہ قسم کے ہیرے..... تمہیں کہاں سے ملا۔“

”یہ بعد کو بتاؤں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”آپ یہ بتائیے کہ آپ اس بار کے بارے میں

جانتے ہیں۔“

”عجیب احسن آدمی ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہار تمہارے پاس ہے اور اس کے متعلق میں بتاؤں۔“

”خیر تو پھر میں ہی بتاؤں۔“ حمید بولا۔ ”آپ نے پرسوں کے اخبار میں کرنل سعید کی آٹا

مال بچی کی گم شدگی کا حال پڑھا تھا۔“

”نہیں.....!“ فریدی نے جواب دیا۔

”خیر..... میں نے پڑھا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خبریں پڑھ چکے کے بعد

نتہا تک چاٹ ڈالتے ہیں۔“

”آگے کہو۔“ فریدی بولا۔

”یہ ہار وہ لڑکی پہنے ہوئے تھی۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”اخبار میں یہ بھی تھا۔“

”لیکن اس کا کیا ثبوت کہ یہ وہی ہار ہے۔“

”ثبوت ابھی پیش کرتا ہوں۔“ حمید نے کہا اور ہار کے سب کے بڑے پھول کے پشت پر

لگے ہوئے سونے کے ڈھکن کو اٹھا کر فریدی کے سامنے پیش کر دیا ڈھکن میں اندر کی جانب ایک ہونٹ کی تصویر فٹ تھی۔ کسی خوبصورت اور نوجوان عورت کی تصویر۔

”کیا تم اس عورت کو پہچانتے ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں.....!“ حمید نے جواب دیا۔

”پھر یہ ثبوت کیا.....!“

”اخبار میں اس تصویر کا تذکرہ تھا۔“

”تمہیں یہ ہار ملا کہاں سے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ایک مچھلی کے جڑوں میں اٹکا ہوا تھا۔“

”کیا.....!“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں۔“

”اچھا تمہیں پھر اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تھا یا نہیں۔“

”نہیں.....!“

”ہوں.....!“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

”بھی تم بھی کمال کرتے ہو۔ ابھی یہی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی ہمارے۔ محض تصویر کی بناء پر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں سمجھتا۔“

حمید پھر خاموش ہو گیا۔ فریدی کچھ سوچنے لگا تھا۔ سب پر وہ کا جھنڈ شور مچاتا ہوا ان کے اوپر سے گزر گیا۔ دونوں رک گئے۔ انہیں توقع تھی کہ یہ جھنڈ دو تین چکر لگانے کے بعد یہیں جھیل میں گرے گا۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ لیکن ان کا خیال غلط نکلا۔ سب پر وہ نے دو چکر لگائے اور پھر مشرق کی طرف اڑتے چلے گئے۔

”قابلاً یہ اگلے تالاب میں گریں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون سا تالاب.....!“ حمید نے پوچھا۔

دونوں اسی طرف روانہ ہو گئے جدھر سب پر وہ کا جھنڈ گیا تھا۔ کھیتوں اور جھاڑیوں سے نکل کر وہ ایک کچی اور کشادہ سڑک پر آ گئے۔ مطلع ابر آلود تھا۔ کبھی کبھی سورج بادلوں سے نکل کر اپنی تیز کرنیں پھیلائے لگتا۔ جہاں یہ لوگ چل رہے تھے سڑک کے دونوں طرف کھائیاں تھیں جن پر سرکٹے کی گھنٹی جھاڑیاں تھیں۔

”شاید کوئی موٹر آ رہی ہے۔“ فریدی نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”موٹر کہاں.....!“ حمید بولا۔ ”مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔“

”آواز تو سنائی دے رہی ہے لیکن شاید ابھی دور ہے۔ آؤ کھائیوں کے ادھر نکل چلیں ورنہ گرد کے ایک طوفان سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔“

دونوں داہنی طرف کی کھائیوں پر چڑھ کر دوسری طرف اڑ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر موٹر کی آواز آئی اور پھر دفعتاً مشین بند کر دی گئی۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہ تھی پھر بھی فریدی کی کھوجی طبیعت بے چین ہو گئی۔ وہ رک گیا۔ کھائی کے قریب آ کر اس نے سرکٹے کی جھاڑیوں سے سڑک کی طرف جھانکا۔ ایک ٹرک سڑک پر کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اتنے میں حمید بھی فریدی کے قریب آ گیا۔

موٹر ڈرائیور موٹر کے نمبروں کی تختی تبدیل کر رہا تھا۔ اس نے پہلی تختی نکال لی اور اس کی جگہ دوسرے نمبروں کی تختی لگا دی۔ تھوڑی دیر تک کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ٹرک پر بیٹھ کر انجن

”ان دونوں ڈاکٹروں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”کام تو قاعدے کا کر رہے ہیں مگر طریقہ کار بالکل احمقانہ ہے۔“

”کیا تم نے بھی کوئی احمقانہ حرکت دیکھی۔“

”جی ہاں ایک زندہ چیتے کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کے جسم سے خون نکال رہے تھے۔“

”لیکن..... وہ چیتا نہیں بلکہ بکرا تھا۔“

”بکرا.....!“ حمید قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔ ”چلے آپ نے اور بھی بتا دیا۔“

”درحقیقت وہ بکرا ہی تھا۔“ فریدی نے کہا اور مختصر الفاظ میں سارے واقعات حیدر

ہوا بولا۔ ”صرف ایک چیز مجھے ان کے خلاف شبے میں مبتلا کر رہی ہے۔“

”وہ کیا.....!“

”بکرے کے بول پڑنے پر ڈاکٹر آصف کا بوکھلا جانا اور دفعتاً میرے ساتھ والے

حمید کا قہقہہ لگا کر اس کا جواز پیش کرنا۔ اگر درحقیقت اس حرکت سے ان کی وہی مراد تھی جو

نے مجھے بتائی تو ڈاکٹر آصف کے گھبرا جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بہر حال یہاں حماقت

پردے میں کوئی بہت ہی بھیا نک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ورنہ اس ویران مقام پر تم

قائم کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”خیر اس کیلئے تو وہ نہایت عمدہ بہانہ تراش سکتے ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”چونکہ ان کے تجربے

وحشی دردوں سے متعلق غائب۔ اس لئے انہوں نے اس کے لئے ایک ویران جگہ منتخب کی۔“

حمید خاموش ہو گیا۔

”اس ہمارا کو احتیاط سے جیب میں رکھ لو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ان لوگوں کے سامنے

تذکرہ نہ کر کے تم نے عقل مندی سے کام لیا۔“

”تو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔“ حمید نے کہا۔

”کنٹرل سعید سے ملے بغیر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ممکن ہے پی ٹی وی

”لیکن یہ ہمارے جھیل میں کیسے پہنچا۔“

اشارت کر دیا اور ٹرک چل دیا۔

حمید نے سوالیہ نظروں سے فریدی کی طرف دیکھا جس کے ماتھے پر بے شمار سلولس آئیں تھیں۔

دوسری عمارت

”یہ معاملہ کیا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”آج سارے کے سارے واقعات انتہائی پراسرار اور آ رہے ہیں۔“

”اور اس کی شروعات تم ہی سے ہوئی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“

”یہ آج صبح ہی صبح تمہارا دماغ کیوں خراب ہو گیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہٹائیے ان باتوں کو۔“ حمید بولا۔ ”آخر اس نے ٹرک کے نمبر کیوں بدلے؟“

”بدلے ہوں گے بھی۔“ فریدی اکتا کر بولا۔ ”وہ سنو! سب پر تو کا شور سنائی دے رہا ہے۔ شاید ہم تالاب کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“

وہ دونوں پھر چل پڑے۔ فوری طور پر خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ تالاب نزدیک ہی تھا۔ ٹرک سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان تالاب کا پرسکون پانی سورج کی کرنوں کے لہریوں سے کھیل رہا تھا۔ مشرق کی سمت سے کچھ تلخ پر اور آئے اور چند پانی پر منڈلانے کے بعد نیچے گر گئے۔ حمید اور فریدی آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ٹیلوں کے پار آئے۔ فریدی نے اپنی دو نالی بندوق اٹھائی۔ فائر ہوا۔ پرندے شور مچاتے ہوئے اڑے۔ فائر ہوا اور دو تین اڑنے والوں میں سے بھی پانی میں گرے۔

”بہت خوب.....!“ حمید چیخا۔ ”دونالی بندوق کا صحیح استعمال صرف آپ جانتے ہیں۔“

”حمید تالاب میں اتر گیا۔“ اس نے بدقت تمام چار پرندے نکالے دو تلخ پر جن کے بازو زخمی ہو گئے تھے کسی طرح ہاتھ نہ آئے۔

”میزے خیال سے تو اتنے ہی کافی ہوں گے۔“ حمید بولا۔

”اگر تمہاری نیت بخیر رہی تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

دونوں واپس ہونے کے ارادے سے کھائیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ آسمان پر پھیلے ہوئے بادل پھٹ کر ادھر ادھر ٹکڑوں کی شکل میں بکھر گئے اور دھوپ تیزی سے چمکنے لگی تھی۔ کھائیوں کے قریب پہنچتے پہنچتے انہیں شدت سے پیاس لگ گئی۔ جیسے ہی وہ سرکنڈے کی جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے اوپر چڑھے انہیں سامنے سڑک کے اس پار ایک عمارت دکھائی دی۔

”عالمبانیہ وہی عمارت ہے جس کا تذکرہ اشرف نے کیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”آؤ چلیں شاید وہاں پانی مل سکے۔“

دونوں عمارت کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر انہیں مشینوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ فریدی عمارت کے چھانک پر لگا ہوا بورڈ پڑھنے لگا۔ ”یہاں خیموں کے ستون تیار کئے جاتے ہیں۔“ چھانک کے اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے ان کی نظر ایک ٹرک پر پڑی فریدی چونک پڑا۔ یہ وہی ٹرک تھا جس کے نمبر سڑک پر بدلے گئے تھے۔ حمید کچھ بولنے ہی والا تھا کہ فریدی نے اسے گھور کر دیکھا۔

کپاؤنڈ میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تین چار بڑے بڑے شید تھے یہاں بانس اور لکڑی کے ڈھیر لگے تھے، ایک آدھ جگہ لکڑی کے برادے کے بڑے بڑے انبار بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا ”منیجر۔“

فریدی جتنی اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے کرسی پر ایک دبلا پتلا معمر آدمی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ فریدی اور حمید کو اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں کسی تجارتی مقصد کے تحت نہیں آیا۔“ فریدی نے کہا۔

”تشریف رکھئے۔“ منیجر مسکرا کر بولا۔ وہ ابھی تک انہیں استعجاب آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ پیاسے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”اوہ.....!“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”تشریف رکھئے۔“ اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

”آپ ان لوگوں کو پانی پلاؤ۔“ اس نے کہا۔ نوکر کے چلے جانے کے بعد وہ پھر فریدی کی طرف مخاطب ہوا۔ ”شاید آپ لوگ ادھر شکار کھیلنے کی غرض سے آئے تھے۔“

”جی ہاں.....!“

”اس سے پہلے بھی کبھی آپ جگے ہیں۔“

”اب سے تقریباً دو سال قبل۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس وقت آپ کا کارخانہ یہاں نہیں تھا۔“

”جی ہاں..... ابھی حال میں یہاں کاروبار شروع کیا ہے۔ اس علاقے میں بانس بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں شہر سے اتنی دور آنا پڑا۔“

”بہر حال یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے یہاں بھی مغربی ممالک کے تاجروں کی طرح لوگ ترقی کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

پانی پینے کی بعد دونوں اٹھ گئے اور منبر پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

سڑک کے قریب سے گزرتے وقت فریدی نے اس کے نمبروں کو غور سے دیکھنا شروع کیا جیسے انہیں وہ زبانی یاد کر لینا چاہتا ہو۔

”کیوں نہیں کیا خیال ہے۔“ فریدی نے کہا۔ دونوں اب سڑک پر پہنچ چکے تھے۔

”کوئی سازش، کوئی جرم۔“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”یہ تو ظاہر ہی ہے، تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔“ فریدی نے کہا۔ ”بہر حال ہمیں ایک نئی دوسری کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔“

”وہ تو ظاہر ہی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”بعض اوقات مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔ کیا اس قسم کے سارے واقعات اور حادثات ہمارا ہی انتظار کیا کرتے ہیں اس بار کو شاید میرا ہی انتظار تھا۔ اس موٹر ڈرائیور کو سڑک ہی پر نمبر تبدیل کرنا تھا ارے یہی کرنا تھا تو اس عمارت کے اندر پہنچ جانے؛ یہ حرکت کی ہوتی۔ کیا یہ ضروری تھا کہ فریدی صاحب اسے دیکھ ہی لیں۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”اسی قسم کے اتفاقات مجرموں کی گرفت کا باعث ہوتے ہیں ورنہ سراغ رساں کوئی دلا اللہ یا دھر ماتما تو ہوتا نہیں کہ پاتال کی خبریں لے آئے۔ مجرموں کی ذرا سی لغزش سراغ رساں کی

کامیابی بن جاتی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر ذرا جلدی قدم بڑھائیے۔ بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔“ حمید بولا۔

شہناز اسٹوپ پر مچھلی کے قتلے تل رہی تھی۔ اشرف نے دوبارہ مچھلیاں پکڑنے کے لئے کانٹے تالاب میں پھینک دیئے تھے اور ایک ڈور ہاتھ میں لئے بیٹھا ادھک رہا تھا۔ ٹیلا اور ثریا گھاس پر کہنیوں کے تل لٹٹی ہوئی انگریزی کے ایک رسالے میں تصویریں دیکھ رہی تھیں۔

”اس وقت شہناز کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”مچھلیاں تل رہی ہیں نا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”بیوقوفم کے عاشق اپنی محبوباؤں کو کھانا پکاتے دیکھ کر کافی محظوظ ہوتے ہیں۔“

”بہر حال خدا نے آپ کو اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔“ حمید جھپٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”خدا ہر شریف آدمی کو اس نعمت سے محروم رکھے۔“ فریدی نے کہا۔

”انگور کھٹے ہیں۔“

”اچھا ٹھہرو..... ابھی بتاتا ہوں کہ انگور کھٹے ہیں یا میٹھے ہیں۔“ فریدی نے کہا اور شہناز کے قریب پہنچ کر پھر بلند آواز میں بولا۔ ”میاں! اگر عورت کھانا نہ پکائے تو مرد بھوکوں مرے اور مارا رومان رکھا رہ جائے۔“

”کیا بات ہے؟“ شہناز نے فریدی سے پوچھا۔

”حمید صاحب فرماتے ہیں کہ انہیں کھانا پکاتی ہوئی عورت انتہائی لچر معلوم ہوتی ہے۔“ فریدی شہیدی سے بولا۔

قل اس کے کہ حمید کچھ کہتا شہناز نے اسٹوپ پر رکھا ہوا فرائی پین زمین پر الٹ دیا اور مچھلی کے قتلے ادھر ادھر گھاس پر بکھر گئے اور شہناز منہ بھلا کر دوڑ جائیٹھی۔

”اے اے اے..... میں نے کب کہا تھا۔“ حمید بوکھلا کر بولا۔ فریدی نے قہقہہ لگایا۔ ثریا، ٹیلا اور اشرف بھی ان ہنکے قریب آ گئے۔

”اے یہ کیا ہوا۔“ ثریا حیرت سے شہناز کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”کچھ نہیں۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”میاں! حمید اب میٹھے انگور کھا کر پیٹ بھریں گے.....“

ہوتا ہے کہ آپ کے ہاتھ مایست ہی مایست رہ جاتی ہے اور انڈا دوسرے چٹ کر جاتے ہیں اور پھر آپ کیا جانیں کہ اس روٹھے اور منانے میں کتنا لطف ہے۔“

”تشریف لے جائیے نا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے آپ کے لئے وہ پر لطف موقع مہیا کر دیا۔ لیکن ذرا خیال رہے ابھی راستے میں جو واقعہ پیش آیا ہے اسے اپنے ہی تک محدود رکھئے گا اور وہ ہار والا معاملہ بھی۔“

حمید شہناز کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ثریا اور شیدا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ اشرف نے فریدی کو آنکھ ماری اور فریدی جھیل میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینک کر چھوٹے چھوٹے دائروں کا بننا بگڑنا دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ خیالات میں ڈوب گیا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر اشرف بیٹھا اگڑ رہا تھا۔ دفعتاً وہ فریدی کی ہنسی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ فریدی خود بخود ہنس کر اس طرح سنجیدہ ہو گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اشرف اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اتفاقاً فریدی کی اور اس کی نظریں ملیں اور فریدی کو پھر ہنسی آ گئی۔

”کیا بات ہے۔“ اشرف نے متعجبانہ لہجے میں پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ ایک احق کا ایک مضحکہ انگیز قول یاد آ گیا۔“

”مضحکہ انگیز قول۔“

”ہاں وہ کہتا تھا کہ تم بڑے بد قسمت ہو اگر یہ نہیں جانتے کہ تمہارے شہر میں کتنے کرل رہتے ہیں۔“

”واقعی مضحکہ خیز ہے۔ بھلا شہر بھر کے کرلوں کو کون گنتا پھرے گا۔“

”میرے خیال میں تو ہمارے شہر میں ایک بھی نہ ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں ایسا تو نہیں، میرے ہی پڑوس میں ایک کرل صاحب رہتے ہیں..... کرل سعید۔“

”قابلاً ریٹائر ہو گئے ہوں گے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”بھئی یہ فوجی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انتہائی شائستہ قسم کا فوجی بھی تھوڑا بہت..... ضابطہ ہوتا ہے۔“

”کیوں حمید۔“

حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ جھنجھلاہٹ اور ندامت نے اسے پر بولنے ہی نہ دیا۔

”تو کیا پھر یہ دونوں لڑ گئے۔“ شیدا نے کہا۔ ”عجیب مصیبت ہے۔ ارے بھئی ہم لوگ نے کیا قصور کیا تھا..... بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔“

شہناز نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ ثریا نے پھر سے فریائی پار اسٹوپ پر رکھا اور بچے ہوئے قتلے تلنے لگی۔ شیدا اور اشرف بیچ پروں کے پر نوچنے لگے۔

”آپ خواہ مخواہ.....!“ حمید فریدی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اچھا جی..... مجھ سے کیا مطلب۔“

”آپ نے خواہ مخواہ جھوٹ۔“

”انگور کھٹے ہیں نا۔“

”بہر حال آپ کا مذاق بھی خطرناک ہوتا ہے۔“ حمید منہ لٹکا کر بولا۔

”میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انگور کھٹے نہیں ہیں۔ بلکہ اس قسم کے فضول نخرے برداشت کرنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”عورت بات بات پر رٹ

ہے اور متوقع رہتی ہے کہ اسے کوئی منائے گا اور اگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو اسے زندگی ویران نظر آنے لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ اس کا وہ

طور پر روٹھ جانا ایسی صورت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب کہ کوئی اسے منائے۔ لیکن اگر اسے یہ توقع پوری نہ ہوئی تو یہی حالت ایک مستقل مظلومیت بن جاتی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ کسی عورت کو مظلومیت کا خطہ ہو گیا تو مرد کے لئے ایک مستقل عذاب بن جاتی ہے کیا سمجھ۔“

”جی ہاں بہت کچھ سمجھ گیا۔“ حمید نے کہا۔ ”دراصل آپ کا علم آپ کے لئے عذاب

گیا ہے۔ آپ کبھی باقاعدہ قسم کی زندگی بسر کر سکتے۔ ایک سیدھا سادا سا مسئلہ عورت

میاں اور بیوی آخر اسے اس قدر الجھانے کی کیا ضرورت ہے، ذہن انسانی کی ایک ایک ریل کریدنے سے فائدہ؟ آپ انڈا کھانے کے بجائے اس کی مایست پر غور کرنے لگتے ہیں۔“

”بیوی گھر ہی میں رہی ہوگی۔“

”ہاں.....!“

”وہ کیا کہتی ہے۔“

”اس کے متعلق مجھے علم نہیں۔ غالباً اس نے پولیس کو اپنا بیان ضرور دیا ہوگا۔“

”کرنل اس پر بگڑا تو بہت ہوگا۔“

”ہوسکتا ہے..... وہ اپنی بیٹی کو چاہتا بہت تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ کسی نے اسے زیور وغیرہ کی لالچ میں قتل کر دیا۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیا

زیورات پہنتی تھی۔“

”آپ ہی کا نہیں بہتوں کا یہی خیال ہے وہ ہیروں کا ایک ہار پہنے ہوئے تھی۔“

”ہیروں کا ہار اور آٹھ سال کی بچی۔“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے عرض کیا تھا کہ کرنل اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔“

”تو اس کا مطلب کہ کرنل کافی مالدار آدمی ہے۔“

”خاندانی رئیس ہے۔“

”پھر بھی کس بچیوں کو اتنے قیمتی زیورات پہنا کر چھوڑ دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

یہی نے کہا۔

”ہے تو حماقت ہی۔“

”سو تلی ماں کا برتاؤ اس کے ساتھ کیا تھا۔“

”میرے خیال سے بُرا نہیں تھا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ بھی اسے بے حد

پہنتی تھی۔ ثریا کا بیان ہے کہ وہ اکثر اسے اپنے پلنگ پر ہی سلا لیا کرتی تھی۔“

”ہوں.....!“

اس نے بعد خاموشی چھا گئی۔ فریدی سگار سلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا اور اشرف پھر مچھلی

نے کی ڈوری طرف متوجہ ہو گیا۔

ثریا اور شیا مچھلیاں تل پکنے کے بعد مسلم بیچ پر بھوننے کے لئے لکڑیاں اکٹھا کر رہی تھیں۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ اشرف بولا۔ ”اب کرنل سعید ہی کو لے لیجئے وہ چوبیس گز فوجی بنا رہتا ہے۔ حد ہوگئی کہ تین چار دن ہوئے کہ اس کی اکلوتی خورد سال لڑکی غائب ہوگئی اور اس کے سکون و اطمینان میں کسی قسم کا کچھ بھی فرق نہیں آیا۔“

”اکلوتی خورد سال بچی۔“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ابھی تو آپ

نے کہا کہ وہ ریٹائر ہو چکا ہے، اس کا مطلب کہ سانی معمر ہوگا اور صرف ایک چھوٹی سی بچی۔“

”اس نے بہت دیر میں شادی کی تھی۔ بچی کے پیدائش کے سلسلے میں بیوی کا انتقال ہو

تھا۔ پھر اس نے پانچ چھ سال تک شادی نہیں کی۔ تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا اس نے ایک کونوا

لڑکی سے دوسری شادی کر لی اور اب پچارہ دن رات دواؤں کے اشتہارات پڑھا کرتا ہے

ایک دلچسپ بات..... وہ بھی ان احمق ڈاکٹروں کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار ڈاک

وحید کو اس کے یہاں جاتے دیکھا ہے، آج سے پہلے مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی۔ یہ سمجھتا تھا

وحید جس کا پہلے میں نام بھی نہیں جانتا تھا، اس کا کوئی ملنے والا ہے۔“

”تو یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کرنل سعید ان سے اپنا علاج کر رہا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”محض قیاس کی بناء پر..... یہ لوگ بوڑھوں کو جوان اور بزدلوں کو شیر بناتے ہیں نا۔ کر

سعید کو اپنی جوان بیوی کی موجودگی میں جوان بننے کی سخت آرزو ہے۔“

”اوہ.....!“ فریدی نے کہا اور پھر تھوری دیر بعد بولا۔ ”اور اس غریب بچی کا کیا ہوا۔“

”کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“

”عائب کس طرح ہوئی تھی۔“

”گھر سے غائب ہوگئی۔“

”کیا گھر میں تھا تھی۔“

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس دوران میں کرنل شہر

موجود نہیں تھا۔“

”کہیں باہر گیا تھا۔“

”جی ہاں۔“

حمید شہناز کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ارے بھائی میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔“ حمید بولا۔

”لیکن میں آپ کی قسم کی ضرورت نہیں محسوس کرتی۔“

”بھئی میں کس طرح سمجھاؤں۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ مجھے سمجھائیے۔“

”عجیب آدمی ہو۔“

”دیکھئے میں خواہ مخواہ بات نہیں بڑھانا چاہتی۔“ شہناز تنک کر بولی۔

”تو میں کب چاہتا ہوں۔“

شہناز نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بعض اوقات فریدی صاحب کا مذاق حد سے بڑھ جاتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

شہناز پھر کچھ نہ بولی۔

”خواہ مخواہ ایک بے ٹکی بات بول کر خود الگ ہو گئے۔“

”تو آپ ہی پر کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی۔“ شہناز بولی۔

”کیا یہ کم مصیبت ہے کہ تم خواہ مخواہ بدگمان ہو گئیں۔“

”ہاں صاحب میں تو مصیبت ہی ہوں۔“

”ارے لاجول ولا قوتہ..... میں نے یہ کب کہا۔ چھوڑو“ حمید بولا۔ ”میں نے؟“

بدگمانی کو مصیبت کہا تھا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ شہناز منہ پھلا کر بولی۔

”فرق..... ارے بھائی بہت بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔“

”تو آپ جانیے تا یہاں سے۔“

”نہیں جاؤں گا۔“

”تو میں خود اٹھی جاتی ہوں۔“

”نہیں اٹھنے دوں گا۔“

”واہ اچھی زبردستی ہے۔“

”اب زبردستی ہی کرنی پڑے گی۔“

”بھئی آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔“

”اچھا میں دفان ہوا جا رہا ہوں۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

شہناز کچھ نہ بولی۔

حمید پیر پختا ہوا فریدی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

فریدی مسکرا کر بولا۔ ”فرمائیے۔“

”واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”میں آج سے کان پکڑتا۔“

”اپنے یا شہناز کے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”خدا را اس کا نام ذرا آہستہ سے لیجئے۔ اگر سن لیا تو قیامت ہی آ جائے گی۔“

”لا حول ولا قوتہ..... تم نے پھر شوہروں جیسی باتیں شروع کر دیں۔ ارے میاں وہ تمہاری

ہے کون۔ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ ارے مارے جان نکلی جا رہی ہے۔ احسب کہیں کے۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سنجیدگی سے کسی مسئلے پر غور کر رہا تھا۔

”حمید.....!“ فریدی تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا۔

”جی..... فرمائیے۔“

”کیا واقعی تم اسے بہت چاہتے ہو۔“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

”تو میں تمہیں ایک نیک مشورہ دیتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”کمی دوسرے کے حق میں دستبردار ہو کر کچھ فقیری لے لو اور بقیہ عمر خدا کی یاد میں گزار دو۔“

”نیکو مشورہ۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے وہ مشورہ دیا ہے کہ میری پشت ہا پشت آپ کی احسان مند رہیں گی۔ لیکن اے طیب روحانی والے رحمت یزدانی یہ دنیا سرائے

فانی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن پرسوں تیسرا۔ ترسوں چوتھا دن۔ غرضیکہ اسی طرح دن گزر جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ کہنے سبب یہ ہے کہ اس منصب عاشقی کے لائق مجھے اپنے علاوہ دوسرا نظر نہیں آتا۔

”مذاق چھوڑو.....“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہیں ایک کامیاب جاسوس چاہتا ہوں۔“

”ضرور دیکھئے۔“ حمید نے کہا۔ ”میں آپ کو منع نہیں کرتا۔ لیکن میں اس کی اتنی ہمارا قیمت ادا نہیں کر سکتا۔“

”لیکن تم تو ابھی کان پکڑ رہے تھے۔“

”تو آپ اس سے کیا سمجھے۔“

”یہی کہ اب تم عشق سے باز آ جاؤ گے۔“

”آپ غلط سمجھے۔“ حمید نے کہا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ اب میں آپ کو موقع ہے، یہ کچھ نہیں تھا۔“

تاؤ نہ دایا کروں گا۔“

”عقل والا تو وہ..... یہی تو میں کہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ: آج کارزار ارومانس کر کر لے دیا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ نے کہا۔ ”لیکن رومانی اعتبار سے میرا دن بڑا حسین رہا۔“

”رومانی اعتبار سے۔“ حمید نے متعجبانہ انداز میں دہرایا۔

”ہاں..... یہی میرا رومان ہے۔ جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے جب کوئی پراسرار؟

میرے سامنے آتی ہے۔ تو مجھے کم و بیش وہی لذت محسوس ہوتی ہے، وہی بے چینی مجھ میں ہو سکتی ہے پھر جیسے جیسے میرے قدم کامیابی کی طرف اٹھتے ہیں میرا جنون تیز سے تیز تر ہوتا ہے۔ کیا سمجھے.....!“

”خدا کرے میں کبھی کچھ نہ سمجھوں۔“ حمید نے کہا۔

”خیر چھوڑو تم کرنل سعید کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“ فریدی نے دفعتاً بات کا

موڑتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔“

”کیا یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ تمہارے دوست اشرف کے بنگلے کے قریب ہی رہتا ہے۔“

”نہیں مجھے اس کاں نہیں۔“

”خیر..... مجھے اس کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ یہ معاملہ مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہاں دیکھو..... اس ہار کا تذکرہ اس وقت تک کسی سے نہ کرنا جب تک

میں اجازت نہ دوں۔“

”تو پھر اس ہار کا کیا کیا جائے۔“ حمید نے پوچھا۔

”یہ دور ان تفتیش میں میری تجوری میں رہے گا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”آخر یہ اس کی پشت پر تصویر کس کی ہے۔“

”عاباً لڑکی کی ماں کی تصویر ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیا اخبار میں اس تصویر کے متعلق

”نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”اس سلسلے میں اشرف سے معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔“

”لیکن براہ کرم آپ اس سے باز رہئے گا۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا معلوم کر چکا۔ اک ذرا اثریاء اور گفتگو کرنی ہے۔“

”کیا اسے یہاں بلا لوں۔“ حمید نے پوچھا۔

”جی نہیں.....!“ فریدی نے کہا۔ ”ہمیں یہ کام نہایت ہی خاموشی سے کرنا ہے۔“

حمید کچھ سوچنے لگا۔ فریدی بھی خاموش ہو گیا۔

”بھئی اب تو بڑی طرح بھوک لگ رہی ہے۔“

”اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ میں اپنا انگوٹھا چوڑنے لگوں۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”کاش تم یہی کر سکتے۔“

”کیوں کیا اس طرح بھی ایک کامیاب جاسوس بننے کے امکانات ہیں۔“

”کیوں نہیں..... کیا تم غزالہ کے چچا پرویز کو بھول گئے۔ وہ کتنی صفائی سے انگوٹھا چوستا

”لیکن وہ جاسوس کب تھا۔“

”اگر مجرم نہ ہوتا تو یقیناً ایک کامیاب جاسوس ثابت ہوتا۔“

تھوڑی دیر بعد ثریا وغیرہ نے دسترخوان لگا دیا۔

”لیکن اس دسترخوان پر صرف چار آدمی بیٹھ سکیں گے۔ میں ثریا، اشرف بھائی اور فریاد صاحب۔ بقیہ لوگوں کے لئے الگ کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔“ شیلانے کہا۔

”بقیہ لوگوں میں مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔“ شہناز چڑ کر بولی۔

”اور..... بقیہ..... لوگوں میں..... میں بھوکا..... قطعی بھوکا نہیں ہوں۔“ حمید اس طرح

رک رک کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا کہ شہناز کے علاوہ سب لوگ ہنس پڑے۔

”تو بہتر ہے آپ لوگ کہیں دور جا کر ہوا کھائیے۔“ ثریا چپک کر بولی۔

”ذرا کچھ خالی پلیٹیں عنایت فرمائیے۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....؟“ شیلانے پوچھا۔

”ہوا کھانے کے لئے۔“

”بات کچھ جچی نہیں۔“ فریدی نے بُرا سامنہ بنا کر کہا۔ ”میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تم کوئی ایسا

بات کہو گے کہ سب بے ساختہ ہنس پڑیں گے۔“

”اب اگر آپ اس جملہ کی گہرائی تک نہ پہنچ سکیں تو میں کیا کروں۔“ حمید نے جھینپ کر کہا۔

تھوڑی سی تفریح

پلنگ سے واپسی کے بعد فریدی نے لباس تبدیل کیا اور سیدھا کو تو والی چلا گیا۔ حمید شہناز

منانا ہوا اس کے گھر تک چلا گیا تھا۔

فریدی شاذ و نادر ہی کو تو والی کی طرف جاتا تھا۔ اس لئے وہاں اس کی موجودگی دوسروں کی

نظر میں خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ آج بھی اسے وہاں دیکھ کر لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین

ہو گئے کہ وہ کس لئے آیا ہے لیکن کسی کی تفسی نہ ہوئی۔

جلدیش آج کل کو تو والی انچارج تھا۔ فریدی کی امداد نے اسے اتنی جلدی ترقی کے ان

مارج تک پہنچا دیا تھا۔ پرانے اور تجربہ کار سب انسپکٹر منہ ہی دیکھتے رہ گئے اور جلدیش کو تو والی

انچارج ہو گیا۔

اس وقت وہ آفس میں بیٹھا پرانے فائل دیکھ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر بیساختہ کھڑا ہو گیا۔

”آئیے..... آئیے..... انسپکٹر صاحب میں کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ سے

لوں۔“ جلدیش بولا۔

”تم دو ہی تو آئے ہو میرے حصے میں۔ ایک حمید دوسرے تم بہانے بازی کے ماہر۔“

فریدی نے ہنس کر کہا۔

”نہیں آپ سے کچ کہہ رہا ہوں۔“

”خیر خیر.....!“ فریدی بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیا کوئی ضروری کام کر رہے ہو۔“

”نہیں تو.....!“

”آؤ کہیں ٹہلیں گے۔“

”چلے۔“ جلدیش نے کہا۔

ٹیکسی کر کے دونوں وکٹوریہ پارک پہنچے۔

”آج کل بیکاری کی وجہ سے طبیعت اکٹایا کرتی ہے۔“ فریدی بولا۔

”یہاں تو دم مارنے کی بھی فرصت نہیں رہتی۔“ جلدیش نے کہا۔

”کیا آج کل کام زیادہ ہے۔“

”آج کل کیا..... ہمیشہ کام زیادہ رہتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس دوران میں کوئی خاص قسم کا حادثہ نہیں ہوا۔“ فریدی۔ گار سلگاتا ہوا

بولا۔

”بعض اوقات بہت ہی عام قسم کے حادثے خاص سے بھی زیادہ بن جاتے ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ارے ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ کرنل سعید کی آٹھ سالہ بچی کھو گئی جس میں ایک بیش قیمت ہیروں کا ہار تھا۔“

”تو کیا ہوا..... مل ہی گئی ہوگی۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ آج تک اس کا پتہ نہیں لگ سکا۔“

”اتنا بیش قیمت ہار پہنا کر اسے اکیلے گھر سے نکالا ہی کیوں گیا۔“

”اکیلے کہاں..... وہ معاملہ ہی عجیب ہے۔“

”یعنی.....!“

”لڑکی اپنے سونے کے کمرے سے غائب ہو گئی۔“

”سونے کے کمرے سے..... تو کیا رات میں کسی وقت۔“

”جی ہاں..... اس کی اطلاع گھر والوں کو دوسرے دن صبح ہوئی۔“

”بہت خوب..... معاملہ دلچپ ہے۔“ فریدی سوچتا ہوا بولا۔ ”اور ہار کے متعلق معلوم ہوا۔ کیا لڑکی ہار پہن کر سوئی تھی؟“

”کرنل کی بیوی تو یہی کہتی ہے۔ وہ دراصل اس کی سوتیلی ماں ہے۔“

”عجیب و غریب لوگ ہیں۔ میں نے انتہائی دولت مند گھرانوں میں بھی یہ نہیں دیکھا اتنے قیمتی زیورات کی طرف سے اتنی لاپرواہی برتی جائے۔“

”کرنل کافی دولت مند آدمی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کی سوتیلی ماں کی حرکت ہے۔“ فریدی بولا۔

”خیال تو میرا بھی یہی تھا لیکن کرنل اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پردوں کے لئے بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ اسے بے حد چاہتی تھی۔“

”ہوں.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا وہ پردے میں رہتی ہے۔“

”نہیں صاحب..... ترقی یافتہ لوگ ہیں..... میرا خیال ہے کہ اس وقت دونوں میاں کسی ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہوں گے۔“

”تو یہ سارے حالات تمہیں اس کی زبانی معلوم ہوئے ہوں گے۔“

”جی ہاں..... کرنل سعید تو یہاں تھا ہی نہیں۔ وہ کل کہیں باہر سے آیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ کسی نے کرنل سے معقول رقم وصول کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔“

”فریدی بولا۔“

”ہوسکتا ہے۔“ جگدیش نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”خیر ہوگا.....!“ فریدی نے کہا ”ہاں بھی تم سے ایک ضروری بات پوچھنی تھی۔“

”پوچھئے۔“

”کبھی جھریالی کی طرف گئے ہو۔“

”اکثر شکار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔“

”اس درمیان کب گئے تھے۔“

”تقریباً دو تین ماہ کا عرصہ ہوا۔“ جگدیش نے کہا۔

”وہاں دو ڈاکٹروں کی تجربہ گاہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا یا نہیں۔“

”جگدیش کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔“

”ہاں ہاں بظاہر ان کی حرکتیں احسانہ ہیں۔“ جگدیش بولا۔ ”لیکن کارنامے قابل تعریف۔“

”کیا کوئی خاص کارنامہ تمہاری نظروں سے بھی گزرا ہے۔“

”ان کے کارناموں کا اعتراف خود حکومت کو ہے۔ جنگ کے نہ جانے کتنے ہی زخمیوں کو ہوں نے بالکل نئی زندگی بخش دی۔ ان کے لئے تجربات کے سلسلے میں خود حکومت ان کی مدد کر رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے کچھ نئے آلات حکومت کے توسط سے منگوائے ہیں۔“

”اور میں اتنا غافل ہوں کہ مجھے ان کے بارے میں آج تک کچھ نہیں معلوم ہوا۔“ فریدی نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”کیوں..... کیا کوئی خاص بات۔“ جگدیش چونک کر بولا۔

”نہیں..... کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اتنے دلچسپ اور قابل آدمیوں سے اتنے دنوں کے بعد ملاقات کر سکا۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں کوئی بات ضرور ہے۔“

”اور ایک چوکیدار جو پھانک کے قریب بنی ہوئی ایک کونٹری میں رہتا ہے۔“
 ”ان لوگوں کے بیانات لئے۔“

”ہاں..... لیکن فضول کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہو سکی جس سے اصل معاملے پر کچھ روشنی

پڑی۔“

”ان میں سے کسی کو مشتبہ بھی قرار دیا یا نہیں۔“

”یوں تو سبھی پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن تمہیں کسی پر شبہ نہیں۔“

”شبہ کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے۔“

”تمہیں کوئی وجہ نہیں مل سکی۔“ فریدی طنزیہ انداز میں بولا۔ ”آخر تمہیں کب سلیقہ آئے

گاتم کہتے ہو کہ وہاں ایک چوکیدار بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ رات بھر جاگتا رہتا ہوگا۔ دوسری

طرف تم یہ بھی کہتے ہو کہ لڑکی رات کو کسی وقت غائب ہوئی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ساری

نزداری چوکیدار پر آپڑتی ہے۔“

”اوہ..... یہی تو مصیبت ہے۔“ جگدیش نے کہا۔ ”وہ غریب تو یقیناً ایک ہفتہ سے بیمار

پڑا ہے۔“

”کئی سائی کہہ رہے ہو یا تم نے خود دیکھا ہے۔“

”جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ اس وقت بھی غشی کی حالت میں تھا۔“

”مالی رات کو بھی وہیں رہتا ہے۔“

”جی ہاں۔“

”بقیہ نوکر.....!“

”سب وہیں رہتے ہیں۔“

”تم نے لڑکی کے سونے کا کمرہ بھی دیکھا۔“

”کوئی خاص بات۔“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ نہیں بھئی..... کیا یہ ضروری ہے کہ میں جو کچھ پوچھوں اس کے پیچھے کوئی خاص بار
 ہی ہو۔“

جگدیش خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ فریدی کے جواب
 سے مطمئن نہیں ہوا۔

”بھائی حمید کے کیا حال ہیں۔“ جگدیش تھوڑی دیر بعد بولا۔

”وہی پرانا مرض۔“

”یعنی.....!“

”عشق بازی۔“

جگدیش ہنسنے لگا۔

”آخر آپ کو اس سے اتنی نفرت کیوں ہے۔“ جگدیش نے سزا کر پوچھا۔

”نفرت نہیں بھئی۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں عشق کا قائل ضرور ہوں مگر اسی صورت میں

بالکل بیکاری ہو۔ بیکاری سے یہ مطلب نہیں کہ کوئی کام نہ ہو بلکہ بیکاری سے مراد بڑھاپا ہے

یعنی جب بالکل ہاتھ پیر تھک جائیں اس وقت عشق کرنا چاہئے۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا اس وقت عشق کہاں ہوتا ہے۔“

”اگر نہیں ہوتا تو عشق سے زیادہ لغو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں۔“

جگدیش مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

فریدی سوچ میں ڈوبا ہوا سگار کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ دفعتاً جگدیش کی طرف مڑ کر بولا

”اس ہمارے متعلق بھی کچھ معلوم ہے..... کس قسم کا تھا۔“

”سونے کی ہشت پہل ٹیکوں پر ہیرے جڑے ہوئے تھے..... درمیانی ٹکلیہ کی پشت

لڑکی کی ماں کی تصویر تھی۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”کنٹرل کے یا

کون کون رہتا ہے۔“

”وہ اور اس کی بیوی۔ تین نوکر، ایک باورچی اور ایک خادمہ۔ پائیں باغ میں ایک

”کاش میں اس وقت وہاں موجود ہوتا“
 ”اوہ.....!“ جگدیش چونک کر بولا۔ ”تو کیا آپ اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں؟“
 ”نہیں..... لیکن کیس دلچسپ ضرور ہے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا تم مجھ کے گھر کسی طرف چلے جاتے ہو۔“
 ”کسی طرح کیا..... ابھی چلے۔“

”نہیں..... میں وہاں انسپکٹر فریدی کی حیثیت سے نہیں جاؤں گا۔“
 جگدیش اس کی طرف استغما یہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”اس وقت چھ بجے ہیں۔“ فریدی اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر
 ”تم ابھی کرنل کے یہاں اسی کیس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں
 جاؤ۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک باوردی سب انسپکٹر پولیس تمہیں تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ جائے“
 ”میں کچھ نہیں سمجھا۔“ جگدیش بے بسی سے بولا۔

”عجیب احمق آدمی ہو۔ کیا اتنے دنوں سے بھاڑ ہی جھونک رہے ہو۔ ارے بھی وہ“
 انسپکٹر میں ہی ہوں گا۔“

”اوہ.....!“ جگدیش چونک کر بولا۔ ”تو گویا آپ سچ اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں؟“
 ”یوں ہی سمجھ لو۔“

”تب تو یہ کوئی معمولی کیس نہیں معلوم ہوتا۔“

”بہت ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”تمہیں کوئی ضروری کام تو نہیں کرنا۔“
 ”نہیں.....!“

”تب تم فوراً کرنل کے یہاں چلے جاؤ۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جگدیش ایک ٹیکسی پر کو توالی کی طرف روانہ ہو گیا اور فریدی سڑک پار کرتا ہوا گھر کے بجائے ایک پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ اس نے شہر کے متعدد چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں کم کرائے پر لے رکھے تھے جنہیں وہ اکثر کسی نہ کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کرتا رہتا تھا تین تنگ گلیاں طے کرنے کے بعد وہ ایک بوسیدہ سی قدیم طرز کی عمارت کے سامنے پہنچا

گیا۔ یہ ایک گندہ سا ہوٹل تھا جہاں کم حیثیت کے لوگ آ کر قیام کیا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر دیہی علاقوں کے مقدمہ باز زمیندار ہوا کرتے تھے۔ اس کا مالک شہر کے مشہور بد معاشوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ فریدی کو دیکھتے ہی وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
 ”ڈرو نہیں..... چل کر میرا کمرہ کھول دو۔“

اس نے میز کی دروازے سے کنجیوں کا لچھا نکالا اور ایک طرف چلے لگا۔

”تمہارے اس نئے دھندے سے میں خوش نہیں ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
 ”جی کون سا دھندہ۔“

”دیکھو مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو۔“

”سچ سچ میں نہیں سمجھا۔“

”کمرہ نمبر دس میں کون ہے؟“

”وہ دراصل.....!“

”دیکھو پولیس کو اطلاع مل چکی ہے کہ تمہارے آدمی دیہاتوں سے بھولی بھالی لڑکیوں کو ہٹالائے ہیں اور تم ان سے پیشہ کراتے ہو۔ میں نے کئی بار تمہیں سمجھایا کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ کیا یہ ہوٹل تمہارے اخراجات کے لئے کافی نہیں۔“
 ”میں..... میں مگر۔“

”فضول باتیں چھوڑو..... میرے سامنے تمہارا کوئی جھوٹ نہیں چل سکتا۔“

”جی بات یہ ہے کہ.....!“

”کوئی بات نہیں ہے۔“ فریدی کڑے لہجے میں بولا۔ ”ان لڑکیوں کو آج ہی یہاں سے ہٹا کر ان کے گھروں کو بھجوا دو۔ ورنہ کل تمہارے ہاتھوں میں جھکڑیاں ہوں گی۔ پولیس کسی مناسب موقع کی منتظر ہے۔“

”جی بہت اچھا۔“

کمرہ کھول کر ہوٹل والا واپس چلا گیا۔ یہ تنگ و تاریک کمرہ تھا جس میں سیلن کی بدبو گونج رہی تھی۔ فریدی نے جیب سے ایک دیا سلائی نکال کر طاق پر رکھی ہوئی موم بتی روشن کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد فریدی ایک ادھیز عمر کے سب انسپکٹر کے بھیس میں کمرے سے ہوا۔ اس نے ایک ٹیکسی رکوائی اور کرنل سعید کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب روشن ہو گئے تھے کی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ہوٹل کے سامنے کاروں، جنوں کے جگمگاتے تھے۔

فریدی سوچ میں ڈوبا ہوا کرنل سعید کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ تقریباً پندرہ میل کے بعد اس نے ٹیکسی ایک جگہ رکوائی اور کرایہ ادا کر کے پیدل چل پڑا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کرنل سعید کے بنگلے کی کپاؤٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ نوکر سے اسے کمرے پر وہ ڈرائینگ روم میں بلوایا گیا۔ جگدیش ایک نوجوان اور خوبصورت عورت سے جا کر رہا تھا۔

”واہ انسپکٹر صاحب..... میں آپ کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔“ فریدی نے جگدیش سے ”آئیے آئیے۔“ جگدیش ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ایک نم کام سے مجھے یہاں آنا پڑا۔ بہر حال میں آپ کے لئے کو تواری میں کہہ آیا تھا۔ کہئے آپ علاوے میں سب خیریت ہے نا۔“

”جی ہاں..... کوئی خاص بات نہیں۔“

فریدی کی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر جم گئیں۔ یہ تصویر اسی عورت کی تھی جس نے بیروں والے ہار میں دیکھا۔ فریدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ جگدیش اسے کرنل صاحب لڑکی کی گمشدگی کا حال بتانے لگا۔ فریدی دلچسپی اور توجہ سے سنتا رہا۔ درمیان درمیان وہ بول پڑتا تھا۔ عورت خاموش تھی۔ کبھی کبھی ایک آدھ ٹھنڈی سانس لے کر وہ بے چینی سے صوفے کے کسمانے لگتی۔

”اور ابھی بیگم صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ۔“ جگدیش عورت کی طرف اشارہ کر کے

”اس صدمے کی وجہ سے کرنل صاحب کے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے۔“

”یعنی.....!“ فریدی نے پوچھا۔

”دماغی حالت درست نہیں۔ اکثر وہ اپنے کتے کو دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔“

جگدیش نے یہ جملہ کچھ ایسے احمقانہ انداز میں کہا کہ فریدی کو ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ بند کرنا پڑا۔

”اچھا.....!“ فریدی عورت کی طرف دیکھ کر بولا۔

”جی ہاں..... بہت ہی تشویش ناک حالت ہے۔“ عورت نے کہا۔

فریدی نے اس کی آواز میں ایک عجیب طرح کی کشش محسوس کی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے دور کہیں دیرانے میں دفعتاً گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔

”واقعی یہ حادثہ بہت ہی افسوس ناک ہے۔“ فریدی بولا۔ ”کیا رات کو یہاں کوئی باہری آدمی آیا تھا۔“

عورت دفعتاً چونک پڑی۔

”جی نہیں..... نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اکثر مہمان تو آتے ہوں گے۔“

”جی ہاں..... کبھی کبھی۔“

”اور کرنل صاحب کے ملنے والے بھی۔“

”جی ہاں۔“

”اس دن کون کون آیا تھا۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی نہیں۔“

”اس وقت کرنل صاحب کہاں ہیں؟“

”میں نے بتایا کہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ انہیں نوکروں کی نگرانی میں ایک الگ کمرے میں رکھا گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ فریدی بولا۔ ”اتنی خراب حالت ہے۔“

تھوڑی دیر بعد رسمی گفتگو کرتے رہنے کے بعد جگدیش اور فریدی اٹھ گئے۔ فریدی کا ایک مقصد تو صل ہو گیا تھا۔ کرنل سعید کے ڈرائینگ روم میں لگی ہوئی تصویر نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ جبرامارا سے نکلنے والا ہار وہی تھا جو کرنل کی لڑکی پہنے ہوئے تھی۔ جگدیش اور فریدی

”میں اتنی جلدی نتائج نکال لینے کا قائل نہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر آپ کا کیا خیال ہے۔“

”ابھی تک کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔“

”کرنل سعید کی بیوی کو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں.....!“

”اعرف کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ کافی حسین ہے۔“

”ہاں بے حد حسین۔“

”اگر میں اس سے عشق شروع کر دوں تو کیسی رہے۔“

”ہر جگہ یہ تدبیر کام نہیں آ سکتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایسی حماقت نہ کرنا۔ ہماری ان حرکتوں

ہاں کے سارے جرائم پیشہ واقف ہو چکے ہیں۔ اب کوئی عورت دھوکا نہیں کھا سکتی۔“

”نہی تو سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔“ حمید اپنے چہرے پر اداسی طاری کرتا ہوا بولا۔

”مال آپ نے اس کی بیوی کے متعلق کیا اندازہ لگایا ہے۔“

”صورت سے تو کسی طرح بھی مجرم نہیں معلوم ہوتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ نظریہ بھی ہر جگہ

مذہب نہیں ہوتا۔“

”پھر آخر کار آمد ہوتا کیا ہے۔“

”ٹھنڈے دل سے ہر معاملے پر غور کرنا۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”اہنہ ہوگا۔“ حمید ہیزیاری سے بولا۔

”خیر..... ذرا اٹھ کر کھڑکیاں اور دروازے بند کر دو۔ نوکروں سے کہہ دو اگر کوئی ملنے کے

آئے تو کہہ دیں کہ ہم لوگ گھر پر موجود نہیں ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں؟“

”عجیب احمق ہو..... ارے بھی کرنل سعید۔“

”اوہ.....!“ حمید اٹھتا ہوا بولا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے کمرے

میں سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے چوراہے تک آئے۔ جگدیش نے ایک ٹیکسی کروائی لیکن فریدی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ گھر واپس جانے کی بجائے حمید کے الفاظ میں مٹر گشتی کرنا چاہتا تو اس کی یہ مٹر گشتی خاص ہی خاص موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی جب کوئی خطرناک کام انجام دیتا ہو جب کوئی الجھا ہوا معاملہ درپیش ہوتا تو فریدی عموماً شہر کی سڑکوں کے چکر لگایا کرتا تھا۔

کرنل سعید

دوسرے دن صبح حمید اور فریدی کرنل سعید کے متعلق ناشتہ کرتے وقت گفتگو کر رہے تھے۔

”آخر آپ اسے یہاں کیوں اٹھالائے ہیں۔“ حمید بولا۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔“

”کیسا چارہ..... آخر معاملہ کیا ہے۔ میں تو ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔“ حمید اکتا کر بولا۔

”میں خود ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکا۔“ فریدی نے کہا۔

”تو پھر اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید بولا۔ ”خواہ مخواہ ہلٹر چمچے گا۔“

”اس کی زندگی خطرے میں تھی۔“

”کیوں.....؟“

”چند مشاہدات کی بناء پر میں ایسا کہہ رہا ہوں۔“

”جلدی کہہ بھی ڈالئے۔“ حمید مضطربانہ انداز میں بولا۔

”ذرا سوچو تو جب اس کی دماغی حالت اتنی خراب تھی تو اسے اس طرح کیوں رکھا گیا

کہ وہ آزادانہ باہر نکل آیا۔ دوسرے یہ کہ اس کے کتے کسی کوٹھری وغیرہ میں بند کرنے کی بجائے

باغ میں کیوں باندھے گئے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہ کتوں سے لڑنے پر آمادہ رہتا

کتوں کو گھر سے ہٹا دینا چاہئے تھا۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ کرنل کی بیوی اس بچی کو اپنی راہ سے ہٹانے کے بعد

خود کرنل کا خاتمہ کر دینا چاہتی ہے۔“ حمید نے کہا۔

فریدی اٹھا۔ اس نے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا ایک کونا ہٹایا اور پھر فرش کے برابر بڑے چوکور پتھروں میں سے ایک ہٹا دیا گیا۔ نیچی سیڑھیاں تھیں۔ فریدی اور حمید نیچے اتر گئے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ حمید نے بڑھ کر ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ ایک زمین دوز کمرہ تھا۔ صاف ستھرا۔ زمین پر قالین تھا۔ ایک طرف ایک صوفہ سیٹ قرینہ رکھا ہوا تھا اور دوسری طرف ایک مسہری تھی۔ جیسے ہی یہ لوگ اندر داخل ہوئے کرنل سعید ہوا ہوا گیا۔ اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آرہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ ان جھپٹ پڑا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریدی نے اسے مسہری پر دھکیل دیا۔

”تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں بند کر رکھا ہے۔“ کرنل سعید گرج کر بولا۔
”محض تمہاری حفاظت کے خیال سے۔“ فریدی پر اطمینان لہجے میں بولا۔
”کیا فضول بکواس ہے۔“

”تو گویا تم اس وقت ہوش میں ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اگر خیریت چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو۔“ سعید پھر گرجا۔

”لیکن آپ اسی طرح بخیریت رہ سکتے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر وہی بکواس..... تم جانتے ہو میں کون ہوں۔“

”اچھی طرح۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کرنل سعید جو پہلی جنگ عظیم میں جرنیوں کے

لڑا تھا اور اب اپنے کتوں سے لڑتا ہے۔“

اچانک کرنل سعید پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ غصے میں پتے ہوئے چہرے پر پسیدی اور چپکتی ہوئی آنکھوں سے ایک عجیب قسم کا غم انگیز اضطراب جھانکنے لگا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے خود پر قابو پالیا۔

”لیکن تم نے مجھے یہاں بند کیوں کر رکھا ہے اور تم کون ہو۔“ کرنل سعید آہستہ سے

”محکمہ سرائے رسانی کا انسپکٹر فریدی۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر میں تمہیں

لے آتا تو تمہارے خوفناک کتے تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔“

”اوہ.....!“ سعید چیخ کر بولا۔ ”تم کون ہوتے ہو میرے نجی معاملات میں دخل دینے

”قانون کا محافظ۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری لڑکی کہاں گئی۔“
”اچھا تو کیا میری لڑکی کو تلاش کرنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔“ کرنل سعید طنز یہ لہجے میں بولا۔ ”کس آلو کے پٹھے نے تمہیں محکمہ سرائے رسانی کا انسپکٹر بنایا ہے۔“
فریدی ہنسنے لگا۔

”دیکھو میں کہتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔“

”کیا تم ڈاکٹر وحید کو جانتے ہو؟“ فریدی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

کرنل سعید چونک پڑا۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”جسے تم نجی سمجھ رہے ہو وہ قانون کی نظروں میں بہت بڑا جرم ہے۔“

”کیا مطلب.....!“ کرنل سعید چونک کر بولا۔

”لڑکی کو عتاب کر کے تم نے پاگل پن کا ڈھونگ رچایا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ جھوٹ ہے، سفید جھوٹ ہے۔“ کرنل سعید چیخ اٹھا۔

”تو پھر تم پاگل پن کا ڈھونگ کیوں رچاتے ہو۔“

”میں ڈھونگ نہیں رچاتا..... میں..... لیکن میں کیوں بتاؤں..... تم میرا کچھ نہیں

کرتے۔“ کرنل سعید چیخ کر بولا۔

”وہ تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔“

”دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس پر مجبور نہیں کر سکتی۔“

”خبر دیکھا جائے گا۔“ فریدی نے بے پروائی سے کہا۔ ”ابھی کوئی ایسی جلدی نہیں۔ میں

تمہیں اس پر غور کرنے کے لئے وقت دیتا ہوں۔“

”مگر تم یہ اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ کرنل سعید نے کہا۔ ”کسی شخص کو اس طرح

نظر بند کرنا بھی قانوناً جرم ہے۔ تمہیں ایک دن اس کے لئے پچھتانا پڑے گا۔“

”ایک دن کیا.....!“ حمید ہنس کر بولا۔ ”میں اسی وقت پچھتانے کے لئے تیار ہوں۔“

فریدی نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔

”جاؤ کرنل کے لئے ناشتہ لاؤ۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”میں تمہیں انہی الجھاؤں کی طرف لانا چاہتا تھا۔“ فریدی بولا۔

”لیکن اس وقت وہ بالکل ہوش میں ہے۔“ حمید بولا۔

”اس کا بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ خاص خاص اوقات میں اس پر یہ حالت طاری ہوتی

ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ وہ اپنی اس کیفیت سے واقف بھی معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے نجی

معاملات میں دخل اندازی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔“

”یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔“

”اتنی ہی حیرت انگیز جتنی اس لومڑی اور خوفناک کتے کی لڑائی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”ڈاکٹر وحید نے یہ بھی کہا تھا کہ اس انجکشن کا اثر وقتی تھا۔“

”بہر حال اس وقت ہم لوگ تین حقوں کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”ابھی دیکھئے اور کتنوں کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ اگر کہیں کرٹل کی بیوی بھی ایسی نکلی تو مزہ ہی

آجائے گا۔“

”اب دیکھو پولیس پر اس کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تک پولیس کو اس کی گمشدگی کی اطلاع ہو چکی ہوگی۔“ حمید نے

کہا۔ ”لیکن اسے بند کر رکھنے سے کیا فائدہ۔“

”ان لوگوں کو حیرت زدہ کرنا جنہوں نے اس کی لڑکی کو غائب کیا ہے۔“ فریدی بولا۔

”مگر آپ تو اس سے ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے اسی نے یہ حرکت کی ہو۔“ حمید نے کہا۔

”بھئی بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میں بھی کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔“

”ابھی آپ نے لومڑی اور اس عارضی اثر رکھنے والے انجکشن کے بارے میں کہا تھا۔

آپ کا یہ خیال ہے کہ کل رات کو ان ڈاکٹروں میں سے کوئی کرٹل سعید کے یہاں آیا تھا۔“

”بہت ممکن ہے۔“ فریدی بولا۔ ”یہ ساری کڑیاں ایک ہی سلسلے کی معلوم ہوتی ہیں بس

انہیں ملانا ہے۔“

”بس ملائے جائیے کڑیاں۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”اللہ نے آپ کی قسمت میں یہی لکھ دیا ہے۔“

حمید چلا گیا۔

”دیکھو کرٹل۔“ فریدی بولا۔ ”میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تمہاری ہی بہتری کے لئے۔“

”جی عنایت کا شکریہ۔ آپ مجھے احسان مند نہ بنائیں تو زیادہ بہتر ہے۔“

”خیر تمہاری مرضی..... لیکن تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“ فریدی بولا۔

پولیس کی حیرانی

تہہ خانے سے واپس آنے کے بعد فریدی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور حمید کچھ اگلیا:

ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

”تم نے کیا اندازہ لگایا۔“ دفعتاً فریدی بولا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا واقعی اس نے پاگل پن کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔“

”بات تو کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔“

”آدی سخت قسم کا ہے۔ ذرا مشکل ہی سے کچھ اگلے گا۔“ فریدی بولا۔

”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر وہ بنا ہوا پاگل تھا تو اسے اپنے

پاگل پن کا اظہار اس وقت کرنا چاہئے تھا جب کہ اسے دیکھنے والے موجود ہوں۔ رات کے

سنائے میں جب غالباً گھر کے سارے افراد سو رہے تھے اس نے یہ حرکت کیوں کی۔ بالکل کون

جیسی حرکتیں تھیں۔ رات کو اس نے ایک ٹانگ اٹھا کر کتوں کی طرح پیشاب بھی کیا تھا۔ اس کی

ان ساری حرکتوں میں اتنی بے ساختگی تھی کہ کیا کہوں اور پھر دوسری بات یہ کہ اس کے کتے بھی

اس سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔“

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کوتوالی انچارج انسپٹر جگدیش کی آمد کی اطلاع ملی۔
 ”لیجئے۔“ حمید بولا۔ ”آگے برخوردار بلند اقبال کرٹل سعید کی گمشدگی کی اطلاع ملے۔“
 ”آؤ بھی آؤ۔“ فریدی جگدیش کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بولا۔

جگدیش دونوں سے مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔

”میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔“ جگدیش بولا۔

”تو اب کرلو۔“ فریدی بولا اور نوکر کو آواز دے کر ناشتہ لانے کو کہا۔

”ایک نئی مصیبت۔“ جگدیش بولا۔

”کیا کرٹل سعید نے اپنے کتے کو کاٹ کھایا۔“ حمید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جگدیش بے ساختہ ہنس پڑا۔

”اماں کیا حمید بھائی تم بعض اوقات بے موقع ہنسا دیتے ہو۔“ جگدیش نے کہا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”کرٹل سعید غائب ہو گیا۔“

”غائب ہو گیا۔“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“

”وہ کیسے؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن وہ گھر پر موجود نہیں۔“

”عجیب احمق آدمی ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ارے بھی کہیں چلا گیا ہو گا۔ کوئی دودھ۔“

ہے کہ غائب ہو گیا۔“

”ارے نہیں صاحب..... اس کی بیوی نے رپورٹ کی ہے۔ وہ رات اپنے کمرے۔“

سویا ہوا تھا۔“

”اوہ.....!“ فریدی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا ایک جوتا باغ میں ملا اور دوسرا غائب ہے۔“ جگدیش نے کہا۔

”لا حول ولا قوت۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس کا ایک جوتا غائب۔“

”کرٹل سعید کو غائب کر دیا۔“

”نہیں بھائی..... میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی کسی سے باغ میں جدوجہد ہوئی جس کے

نتیجے میں اس کا ایک جوتا باغ میں رہ گیا۔“

”تو کون سی مصیبت آگئی..... وہ جوتا باغ سے اٹھا کر پھر بنگلے کے اندر لے جایا جاسکتا ہے۔“

”ارے یار مذاق چھوڑو۔“ جگدیش بولا۔ پھر فریدی کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”میرا

ذہن یہ ہے کہ اُسے کوئی زبردستی اٹھا کر لے گیا۔“

”بڑا انداز خیال ہے۔“ حمید بولا۔

”چپ رہو بھی۔“ فریدی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ پھر جگدیش سے بولا۔

”وہ باغ میں کس طرح پہنچا۔ اس کی بیوی کے بیان سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کڑی نگرانی

میں رکھا جاتا ہے۔“

”لیکن اس کی بیوی نے آج یہ بھی بتایا کہ اس پر وہ مجنونانہ کیفیت ہر وقت طاری نہیں رہتی

فی۔ خصوصاً رات کے وقت اس پر اس قسم کا دورہ پڑتا تھا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رات کے کس

ھے میں اس کی یہ حالت ہوگی۔“

”بہر حال اس کے گھر والوں کو چاہئے تھا کہ کم از کم رات ہی کو اس کی نگرانی کرتے۔“

فریدی بولا۔

”وہ تو ایک الگ سی بات ہے کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔ اب یہ نئی مصیبت کون سنبھالے

گا۔“ جگدیش نے کہا۔

”جس کے سر پڑے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”پھر وہی۔“ فریدی نے اسے ڈانٹا۔

”بھائی حمید ہیں بھلا ان کی زبان کون روک سکتا ہے۔“ جگدیش نے ہنس کر کہا۔

”تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ فریدی نے جگدیش سے پوچھا۔

”میں پوچھنے کے لئے تو حاضر ہوا ہوں کہ کیا ارادہ کروں۔“

”فی الحال یہ ارادہ کرلو کہ تم کچھ نہ پوچھو گے۔“ حمید بولا۔

”خیر چلو.....!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ اس نے کپڑے پہنے اور جگدیش کے رات جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ابھی وہ دونوں برآمدے ہی میں تھے کہ حمید بھی تیار ہو کر آگیا۔

”تم کہاں چلے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جہاں آپ.....!“

”ہم تو کرنل سعید کے یہاں جا رہے ہیں۔“ جگدیش نے کہا۔

”کرنل سعید کی بیوی میری رشتہ دار ہوتی ہے۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”میں تمہاری رشتہ داریاں خوب سمجھتا ہوں۔“ جگدیش ہنس کر بولا۔

فریدی کی کار کرنل سعید کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔

کرنل سعید کے پائیں باغ میں دو سب انسپکٹر اور تین چار کانسیبل بیٹھے نوکرا

بیانات لے رہے تھے انہیں دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

”کوئی خاص بات۔“ جگدیش نے ایک سب انسپکٹر سے پوچھا۔

”ابھی تک تو کوئی کام کی بات نہیں معلوم ہو سکی۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔

یہ تینوں انہیں دہیں چھوڑ کر برآمدے میں آئے جہاں کرنل سعید کی بیوی بیٹھی کڑا

کے چند دوستوں کو اس کی گمشدگی کے متعلق بتا رہی تھی۔

”معاف کیجئے گا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”ہم ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینا چاہتے ہیں۔“

”فرمائیے۔“ کرنل کی بیوی اٹھتی ہوئی بولی۔

”ہم کرنل صاحب کے سونے کا کمرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”ضرور.....!“ کرنل کی بیوی نے کہا پھر اپنے مہمانوں سے معذرت کرنے

فریدی وغیرہ کے ساتھ ہوئی۔

یہ لوگ کرنل کے سونے کے کمرے میں آئے جو بہت ہی فراخ دلی کے ساتھ بتایا

دیواروں پر زیادہ تر نیم عریاں تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ایک آدھ جگہ جنسی معلومات

چارٹ بھی لٹکے ہوئے تھے۔ فریدی تجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ

قریب آیا۔

”اوہ.....!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے سر ہانے رکھی ہوئی ایک سرخ

اٹالی۔ پھر کرنل کی بیوی کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنے کے لئے سوچ رہا ہو۔

”کیا اس سرخ کے متعلق کچھ پوچھ سکتا ہوں؟“

”ہاں وہ اکثر اپنے ہاتھ سے خود ہی انجکشن لیا کرتے تھے۔“ کرنل کی بیوی نے کہا۔

”کس قسم کے انجکشن.....!“

”درہ گردہ کے۔“

اس دوران میں فریدی سر ہانے رکھا ہوا تکیہ ہٹا چکا تھا۔ دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھ

میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی، جس میں کوئی سفیدی سیال شے بھری ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں۔“

فریدی سوچنے لگا۔

”کیا وہ کسی کے زیر علاج تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”ان کا کوئی ڈاکٹر دوست تھا۔“

”کوئی نہیں۔“

”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی ایسا دوست ان سے ملنے کیلئے آتا تھا جو ڈاکٹر ہو۔“

کرنل سعید کی بیوی چونک پڑی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی بدلتی ہوئی حالت پر قابو پایا۔

”میرے خیال سے تو کوئی ایسا آدمی نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو کیا کرنل صاحب کسی ڈاکٹر سے مشورہ لئے بغیر ہی انجکشن لے لیا کرتے تھے۔“

”نہیں آج سے دو سال قبل کسی ڈاکٹر نے انہیں مشورہ دیا تھا۔“

”کل رات یہاں کون کون آیا تھا۔“

”ایک تو انسپکٹر صاحب۔“ وہ جگدیش کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اور ایک صاحب

انہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔“

رہ گم آیا کرتے تھے۔ لیکن ان میں ڈاکٹر وحید کا نام نہیں تھا۔ فریدی کچھ سوچنے لگا۔ حمید غور سے کرٹل کی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

فریدی اس سے چند اور سوالات کرنے کے بعد واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ سرخ اور شیشی کرٹل کی بیوی کی اجازت سے اس نے اپنی جیب میں ڈال لی تھیں۔

جلد لیش وہیں رہ گیا۔ حمید اور فریدی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

”مجھے تو اس عورت پر شبہ ہے۔“ حمید بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”آوارہ معلوم ہوتی ہے۔“ حمید پھر بولا۔

”کیوں؟ آوارہ کیوں معلوم ہوتی ہے۔“

”اس لئے کہ اس کے بائیں چیر کی چھوٹی انگلی کے پاس والی انگلی تناسب کے اعتبار سے

چھوٹی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بقیہ انگلیوں کی سطح سے کچھ اونچی ہو۔“

”کیا فضول بکواس ہے۔“ فریدی کچھ اکتا کر بولا۔

”صدیوں کے تجربات کا نچوڑ پیش کر رہا ہوں۔“

”بکومت.....!“

”اور جب وہ خاموش ہوتی ہے تو اس کے ہونٹ کھل جاتے ہیں اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔“

”تو پھر اس سے کیا۔“

”اور مسکراتے وقت اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”آسکر وائلز

نے لکھا ہے کہ یہ نطفہ تحقیق ہونے کی علامت ہے۔“

فریدی بے اختیار ہنس پڑا۔

”ابھی تک تو وہ خود آوارہ تھی اور اب تم اس کی ماں کی آوارگی ثابت کرنے بیٹھ گئے۔

فضول بکواس کر کے میرا دماغ مت خراب کرو۔“

”ان کے علاوہ۔“

”ان کے علاوہ کوئی باہری آدمی یہاں آیا ہی نہیں۔“

”ان کا دماغ کب سے خراب تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ بچی کے غائب ہونے کے بعد ہی ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔“

”آدمیوں کو بھی تنگ کرتے رہے ہوں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ کرٹل کی بیوی بولی۔ ”میں نے اکثر رات میں انہیں صرف کتوں پر چڑ

دیکھا ہے۔“

”رات کے کس حصے میں۔“

”ایک رات تقریباً تین بجے اتفاقاً میری آنکھ کھل گئی۔ پائیں باغ میں شور سن کر میں

کھڑکی سے جھانکا، باہر اندھیرا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دو کتے لڑ رہے ہوں

ہمارے کتے آپس میں کبھی نہیں لڑتے، میں سمجھی شاید کوئی باہری کتا آ گیا ہے۔ میں نے مار

اٹھا کر باہر روشنی ڈالی، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ ایک

ہمارا کتا تھا اور دوسرے خود کرٹل صاحب، وہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اچھل اچھل کر کتے پر

کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ بالکل کتے جیسی آواز میں بھونکنے جا رہے تھے۔ میں نے نوکر دار

جگایا۔ وہ کسی نہ کسی طرح انہیں اڑا لائے۔ وہ اس وقت ہوش میں نہ تھے۔ بہر حال میں

اس دن سے ان کی کافی نگرانی شروع کر دی تھی۔ لیکن وہ رات کو کسی نہ کسی طرح کمرے سے

نکل ہی جاتے تھے۔ کل رات بھی شاید وہ باہر نکل گئے۔ پھر معلوم نہیں کیا حادثہ پیش آیا۔“

”آپ کی دانت میں ان کا کوئی دشمن تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ فوجیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کرٹل صاحب

بہت اکھڑ آدمی ہیں۔ اس لئے اگر انہوں نے کچھ دشمن پیدا کر لئے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات

نہیں۔ لیکن میں یہ نہ بتا سکوں گی کہ ان کا دشمن کون ہے ایسے تو جتنے بھی ان کے ملنے کے

آتے ہیں سبھی ان کے بگڑی دوست معلوم ہوتے ہیں۔“

فریدی کے استفسار پر کرٹل کی بیوی نے کئی ایسے لوگوں کے نام اور پتے لکھوائے جو

”ایسی باتوں سے دماغ روشن ہوتا ہے۔“

”پھر وہی۔“

”تندرستی اچھی رہتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں نہیں اڑتیں۔ سر نہ چکراتا، آنکھوں کی کھوئی ہوئی روشنی واپس آ جاتی ہے۔ دانت مضبوط اور چمک دار ہو جاتے ہیں خواب صاف دکھائی دیتے ہیں، آدمی بھوت پریت کے سائے سے محروم رہتا ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔!“

”ارے بابا بند کرو۔۔۔۔۔ یہ بکواس۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

پھر احمقوں میں

حمید خاموش ہو گیا۔ کار تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ سڑک کے پر رونق بازار چھوڑتی ہوا ایک سنسان سڑک پر مڑ گئی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ حمید چونک کر بولا۔

”جھریالی۔۔۔۔۔!“

”کیوں؟“

”ڈاکٹروں سے ملنے۔“

”لاحول ولا قوۃ خواہ مخواہ وقت برباد کریں گے آپ۔۔۔۔۔!“

”فضول بکواس مت کرو۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کرنل سعید کو پاگل بنانے میں انہیں کا ہاتھ ہے۔“

”یہ میں اس وقت سمجھ سکتا تھا جب سعید قطعی پاگل ہوتا ہے۔“

”تو کیا آپ کو اس کے قطعی پاگل ہونے میں شبہ ہے۔“

”قطعی پاگل ہونے سے میری مراد ہر وقت کی بیہوشی ہے۔“ فریدی بولا۔

”ہی کو وہ کیوں پاگل ہو جاتا ہے۔“

”بہت ممکن ہے کہ خود انہوں نے اسے کوئی ایسی دوا دی ہو جس کا وقتی اثر یہ ہوتا ہے۔“

حمید بولا۔

”میں سب دیکھنے کے لئے تو چل رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آخر وقتی طور پر اسے پاگل بنانے کا کیا مطلب ہے۔“

”کچھ عجیب اتفاق ہے کہ معاملہ لڑکی کی تلاش سے شروع ہو کر باپ کے پاگل پن پر ختم ہو گیا۔“ حمید نے کہا۔

”میں معاملہ ختم کہاں ہوا۔ وہ تو اب شروع ہوا ہے۔“

”وہ انشاء اللہ زندگی بھر اسی طرح شروع ہوتا رہے گا۔“

”تم احسن ہو، جہاں ذرا سی محنت پڑی جان نکلنے لگی۔“ فریدی نے کہا۔

”اسے آپ ذرا سی محنت کہتے ہیں۔“

”دیکھو خواہ مخواہ بک بک کرتے رہنے کی عادت اچھی نہیں۔“

”معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔ میری پہلی بک آپ کی کامیابیوں کی ذمہ دار ہے۔“ حمید بولا۔

”بہت اچھے! بڑی شاندار بکواس ہوتی ہے آپ کی۔ کابل اور کام چور عورتوں کی سی باتیں

لے ہو۔“

”عورتوں۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ عورتوں۔۔۔۔۔ ذرا ایک بار پھر کہئے۔“ حمید سینے پر ہاتھ مارتا ہوا

”اگر اسی طرح عورت افزائی کرتے رہے تو کیوں مجھے اکتانا پڑے۔“

”پھر وہی عورت۔“ فریدی جل کر بولا۔ ”اگر یہی عالم رہا تو ایک دن تم خود عورت ہو جاؤ گے۔“

”اور آپ اس وقت کہاں ہوں گے؟“ حمید نے پوچھا۔

”جہنم میں۔“

”تو گویا نوز باللہ۔“

”خاموش رہو۔۔۔۔۔ ورنہ میں تمہارا سر اسٹیرنگ سے لڑا دوں گا۔“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔

”اچھا پھر اس کے بعد آپ کہاں ہوں گے۔“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت اسے سچ مچ حمید کی بے نیکی بکواس بہت کھل رہی تھی۔

”بس اتنی معمولی سی بات، میں تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کوئی بڑی خدمت مجھ سے لینے والے ہیں۔“ ڈاکٹر وحید نے مسکرا کر کہا۔

فریدی نے شیشی اسے دے دی اور اس کے حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لینے لگا۔ ڈاکٹر وحید کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نہ تھے۔ اس نے نہایت اطمینان سے شیشی کا عرق ایک ٹسٹ ٹیوب میں انڈیا اور اس میں کچھ دوسری چیزیں ملا کر اسپرٹ بپ پر گرم کرنے لگا۔

دفعتاً تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے عجیب قسم کی آواز نکلی اور وہ گھوم کر تھیر آ میز انداز سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ چیز آپ کو کہاں سے ملی۔“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

”یہ کیا ہے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”میرا دعویٰ تھا کہ اس کا راز صرف میں ہی جانتا ہوں مگر.....!“ وہ پریشانی کے لہجے میں بولا۔

”یعنی.....!“

”آپ کو یہ کہاں سے ملا.....؟“

”کرنل سعید کے یہاں.....!“

”کرنل سعید کے یہاں۔“ ڈاکٹر وحید نے اچھل کر کہا۔

”جی ہاں۔“

”تو وہ حضرت اسے یہیں سے چرا کر لے گئے ہیں۔“ ڈاکٹر وحید بے ساختہ بولا۔

”آپ اسے جانتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اچھی طرح..... وہ میرے زیر علاج ہے۔“

”کس چیز کا علاج کر رہے ہیں آپ۔“

”جنسی کمزوری کا۔“

”اوہ لیکن اس شیشی میں کیا چیز تھی۔“

”ہمارا ایک نامکمل تجربہ۔“ ڈاکٹر وحید نے کہا۔ ”یہ بھی جنسی کمزوری ہی کی ایک دوا ہے

حمید بھی شاید سمجھ گیا تھا اس لئے اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ فریدی کا رک رکنا بہ لمحہ تیز کرتا جا رہا تھا۔

جھریالی پہنچ کر فریدی نے کار کچے راستے پر اتار دی۔ تجربہ گاہ کے سامنے پہنچ کر کار اگنی۔ کل ہی والا پہرے دار آج بھی پھانگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ فریدی کو کار سے اترتے دیکر کھڑا ہو گیا۔

”سلام صاحب۔“

”سلام! ذرا یہ کارڈ اندر بھجوا دو۔“ فریدی نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیب سے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

پہرے دار نے کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی اندر سے آیا اور اس نے کارڈ اسے دے دیا۔ فریدی اندر بلا لیا گیا۔

دونوں ڈاکٹر لیبارٹری میں کوئی تجربہ کر رہے تھے۔ انہوں نے فریدی کو وہیں بلا لیا۔ جیسے ہی وہ دروازے کے قریب پہنچے اندر سے کسی شیرخوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اندر پہنچ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ آواز ایک خرگوش منہ سے نکل رہی تھی جسے ڈاکٹروں نے ایک مشین میں لگے ہوئے پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ حمید کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”اوہ آپ۔“ وحید نے چونک کر کہا۔ ”شاید کل بھی تو آپ آئے تھے، لیکن آپ۔“

”نہیں بتایا تھا کہ آپ کون ہیں۔“

”اس قسم کا کوئی موقع ہی نہیں آیا تھا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میں ایک تکلیف دینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

فریدی نے وہی شیشی نکالی جو اس نے کرنل سعید کے بستر پر پائی تھی۔

”میں اس سیال کا تجربہ چاہتا ہوں۔“

لیکن ابھی اس قابل نہیں کہ اسے کسی آدمی پر استعمال کیا جاسکے۔“

”شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اسے ایک آدمی استعمال کرتا رہا ہے۔“

”کون.....؟“

”کرنل سعید۔“

”ارے..... مجھے اس کا علم ہی نہیں۔ تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا.....؟“

”نتیجہ ہی کے سلسلے میں مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔“ فریدی نے کہا اور کرنل سعید کے پاگل پن کی داستان دہرا دی۔ ڈاکٹر وحید کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہو گئی۔

”ادہ..... تب تو میرا تجربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔“ ڈاکٹر وحید مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

”مگر یہ ہے کیا بلا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”آپ کتوں کی جنسیت کے بارے میں تو جانتے ہی ہوں گے۔“ ڈاکٹر وحید بولا۔

”اسی فطریے کو سامنے رکھ کر ہم کتے کے غدود کے انجکشن کے سلسلے میں تجربہ کر رہے تھے۔ ہم نے دوا تو تیار کر لی تھی لیکن ابھی تک اطمینان نہیں ہوا تھا۔ کرنل سعید نے ہماری یہ مشکل بھی دور کر دی۔ اگر وہ چند روز تک متواتر اسے استعمال کرتا رہا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا.....“

پھر تہ، جوان ہی نہیں بلکہ نوجوان ہو جائے گا۔“

”بشرطیکہ اس دوران میں اس کی ملک الموت سے ملاقات نہ ہو گئی ہو۔“ حمید بے ساختہ بولا۔

”کیا مطلب.....؟“

”وہ اسی پاگل پن کے عالم میں کل رات کہیں غائب ہو گیا۔“ فریدی نے کہا۔

”غائب ہو گیا۔“ وحید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”خیر فکر کی بات نہیں..... یہ پاگل پن عارضی ہوتا

ہے، اسے جب بھی ہوش آئے گا وہ واپس آ جائے گا۔“

”لیکن اسے یہ دوا ملی کیسے؟“

”میری حماقت کی وجہ سے۔“ وحید بولا۔ ”میں نے دراصل اسے اپنے اس تجربے کے

متعلق بتا دیا تھا اور یہ دوا بھی دکھادی تھی جو ایک بوتل میں رکھی ہوئی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مٹا نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ابھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ

بڑھاپے میں کسی جوان عورت سے شادی کر لینا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ کرنل کی بے خبری نے اسے یہ دن دکھایا۔ اس نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کا تجربہ اسی پر کروں لیکن میں خواہ مخواہ کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھا، آخر وہ اسے چرا ہی لے گیا۔“

”آپ اکثر و بیشتر اس کے گھر بھی جاتے رہے ہوں گے۔“

”ہاں اکثر اتفاق ہوا ہے، جب کبھی شہر جاتا ہوں اگر وقت ہوتا ہے تو اس سے ضرور مل لینا

ہاں۔ آدمی دلچسپ ہے۔“

”اس کی لڑکی کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔“

”ہاں میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ واقعی افسوس ناک حادثہ ہے۔“

”اور اب وہ خود بھی غائب ہو گیا۔“ فریدی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی عزیز

ایک دولت کے لالچ میں ایسا کر رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی بیوی کی جان بھی خطرے

میں ہے۔“

”بہت ممکن ہے، اس قسم کے سینکڑوں واقعات سننے میں آتے ہیں۔“ وحید بولا۔

”کل میں آپ کی تجربہ گاہ کے سب شعبے نہیں دیکھ سکا۔“ فریدی نے کہا۔

”تو آج ہی دیکھ لیجئے..... ہمیں خوشی ہوگی۔“ ڈاکٹر وحید بولا۔

”پہلے بچوں کی طرح رونے والے اس خرگوش کا اجرا بیان کیجئے۔“ حمید نے کہا۔

”یہ بھی بالکل نیا تجربہ ہے۔“ ڈاکٹر وحید مسکرا کر بولا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ آدمیوں کی

ارت بدل جاسکتی ہے اس سلسلے میں ابھی ہم جانوروں پر تجربہ کر رہے ہیں۔“

”صاحب واقعی ہمارے ملک میں آپ لوگوں کا دم غنیمت ہے۔ یقیناً آپ سائنس کی دنیا

ماندارا سونچا کریں گے۔“ فریدی بولا۔

”آئیے..... میں آپ کو بقیہ شعبے دکھاؤں۔“ ڈاکٹر وحید نے دروازے کی طرف بڑھتے

سے کہا۔

”یہ دیکھئے..... یہ ہمارا ننھا سا بچلی گھر ہے جس سے ہم اپنی ضرورت کے مطابق بجلی

واٹر کیسے میں۔ یہاں اس کمرے میں ادویات رکھی جاتی ہیں اور آئیے ادھر تشریف لائیے۔ جی

ہاں یہ نباتات کا کمرہ ہے۔ یہاں دنیا کے سارے ممالک کی کارآمد نباتات کے نمونے ہیں۔
 ”کیا آپ نے شیر بھی پال رکھے ہیں۔“ دفعتاً حمید نے چونک کر پوچھا۔ اسے ابھی
 ایک خوفناک گرج سنائی دی تھی۔

”جی ہاں..... اس سامنے والی عمارت میں درندے ہیں۔“

”تو کیوں نہ لگے ہاں ان کو بھی دیکھ لیں۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن مجھے فحس ہے کہ آپ انہیں قریب سے نہ دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ ابھی تک وہاں کا
 انتظام نہیں ہو سکا۔ درندے کمروں میں بند ہیں۔ خود ہم لوگ بھی ادھر بہت کم جاتے ہیں
 ”یہ چیز تو خطرناک ہے۔“

”کیا کیا جائے..... حکومت نے کٹھروں کا وعدہ تو کیا ہے، دیکھئے کب تک ملے

ڈاکٹر وحید بولا۔

”گھبرائیے نہیں آپ کو بہت جلد کٹھرے بھی مل جائیں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ کیسے۔“

”میں ایک رپورٹ پیش کر دوں گا کہ موجودہ حالت میں درندوں کا رکھنا خطرناک

فریدی بولا۔

”ہم آپ کے انتہائی ممنون ہوں گے۔“

”لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ شیر رکھتے ہی کیوں ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”ان سے ہم بزدلوں کو شیر بنانے میں مدد لیتے ہیں۔“ ڈاکٹر وحید نے کہا۔

”یعنی.....!“

”شیر کے غدد کے انجکشن.....!“

”ہاں صاحب..... اگر آپ کسی کو گدھے کے غدد کے انجکشن دیں تو کیا ہو۔“

مسکرا کر پوچھا۔

”تو وہ آپ کی طرح فضول بکواس کرنے لگے گا۔“ فریدی نے جھنجھلا کر کہا۔

ڈاکٹر وحید ہنسنے لگا۔

”اچھا ڈاکٹر اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ فریدی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ
 بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ارے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔“ وحید نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمیں

اس قابل سمجھا۔“

”فریدی اور حمید کار پر بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

”کیوں حمید کیا خیال ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ان لوگوں پر کسی قسم کا شبہ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“ حمید بولا۔

”کیوں.....؟“

”بے چارے نے سب کچھ صحیح صحیح تو بتا دیا۔“

”خیر اس کا علم تو مجھے کرٹل سعید سے گفتگو کرنے کے بعد ہی ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ان حرکتوں

کا ذمہ دار خود ہے۔“

”تو پھر یہاں تک دوڑے آنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”محض اپنے اطمینان کیلئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کوئی اور خاص بات تم نے مارک کی۔“

”کوئی نہیں..... مجھے تو کوئی خاص بات نہیں دکھائی دی۔“

”اس لئے تو کہتا ہوں کہ تم کبھی ایک کامیاب جاسوس نہیں ہو سکتے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیا

تم نے یہ چیز نوٹ نہیں کی کہ ڈاکٹر وحید کو تو کرٹل سعید کے گھر جانے کا اقرار ہے لیکن کرٹل کی

پہل اس سے انکار کرتی ہے۔“

”اوہ..... تو پھر..... آپ اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔“

”یہاں سوچ رہا ہوں کہ کیا نتیجہ اخذ کروں۔“

”بہر حال یہ چیز تو ظاہر ہو گئی کہ کرٹل کے پاگل پن اور اس کی بیٹی کی گمشدگی میں کوئی تعلق

نہیں۔ اب یہ بتائیے کہ کرٹل کا کیا ہو گا۔“

”جب تک اس کی لڑکی کے متعلق نہ معلوم ہو جائے اسے تہہ خانے ہی میں رکھوں گا۔“

”مگر یہ چیز ہے خطرناک.....!“ حمید نے کہا۔ ”فرض کیجئے اگر اس کے متعلق آپ کو کچھ

نہ معلوم ہو سکا تو کیا ہوگا۔“

”وہ تو اب معلوم ہو کر ہی رہے گا۔“ فریدی نے پراطمینان لہجے میں کہا۔

حمید کچھ سوچنے لگا۔ دفعتاً اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی نیا خیال ہوا تھا جسے وہ ایک نا تجربہ کار بچے کی طرح فوراً ہی اگل دینے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔

”کرنل سعید کی بیوی کی غلط بانی کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔“ حمید بولا۔ ”وہ کیا۔“

”نسوانی شرم..... کرنل سعید اپنی جنسی کمزوری کا علاج کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر

سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ اس لئے اس نے اس کا نام لینا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔“

”کوڑی تو تم بہت دور کی لے آئے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن اس چیز کو بھی پیش

رکھو کہ کرنل کے پاگل پن کی اطلاع خود اسی نے پولیس کو دی تھی اگر وہ چاہتی تو اسے

چھپا لیتی۔ کیونکہ کرنل اس دوا کو اسی وقت استعمال کرتا تھا جب اسے یقین ہو جاتا تھا کہ گھر

سب لوگ سو رہے ہیں۔“

”آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ کرنل نے دوا چرائی تھی۔ ممکن ہے اس کی بیوی کو بھی

کا علم نہ رہا ہو۔ اسی لئے اس نے کرنل کی حرکتوں کو پاگل پن ہی سمجھا ہو۔“ حمید نے کہا۔

”بھی تم آج بہت عقل مندی کی باتیں کر رہے ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”پیٹھ ٹھونکنے اس بات پر۔“

فریدی نے ایک گھونٹہ حمید کی پیٹھ پر جڑ دیا۔

”کار سنبھالئے..... کار.....!“ حمید چیخا۔

کار چمچ اٹھ اس دفعہ ایک تناور درخت کی طرف گھوم گئی تھی۔ لیکن فریدی نے بڑی

سے اسٹیزنگ گھما کر کار کو سڑک پر لگا دیا۔

دفعتاً ایک ٹرک کار کے پیچھے سے آگے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹرک کافی تیز رفتاری کے ساتھ

جاری تھا۔

”حمید.....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”یہ تو وہی ٹرک ہے۔“

”ہون سا۔“

”وہی جوکل دیکھا تھا جس کے ڈرائیور نے نمبروں کی تختی بدلی تھی۔“ فریدی نے کہا اور کار

کی رفتار کچھ تیز کر دی۔

ٹرک پر بانس کے گٹھے لدے ہوئے تھے۔ فریدی کی کار اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

”کھال لے چلے۔“ حمید بولا۔

”عجب احمق ہو..... اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکل جانے دوں۔“

”ابھی مسئلہ حل نہیں ہوا اور دوسرے میں ٹانگ اڑادی گئی۔“

”جتنے زیادہ معاملات ہوں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

”آپ کی مرضی۔“

”دیکھنا یہ ہے کہ ٹرک جاتا کہاں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اور اس کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے لوٹ آئیں گے۔“ حمید بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ٹرک اور کار کا فاصلہ برابر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس

نے یہ بھی محسوس کیا کہ ٹرک کا ڈرائیور آہستہ آہستہ ٹرک کی رفتار تیز کرتا جا رہا ہے۔ سڑک بالکل

سناں تھی۔ اس لئے اسے کوئی خاص دقت بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔

مزدوروں میں تکرار

ٹرک کے پیچھے کے حصے میں جہاں خیموں کے ستون رکھے ہوئے تھے دو قوی ہیکل گورکھے

ٹپٹے ہوئے تھے۔ وہ ٹرک کے جھکوں سے ادھر ادھر مل جانے والے ستونوں کو سنبھالتے جا رہے

تھے فریدی غور سے ان کی یہ حرکت دیکھتا رہا۔ پھر دفعتاً وہ حمید سے بولا۔

”کچھ دیکھ رہے ہو۔“

”کیا.....!“

”ان ستونوں کے سلسلے میں اتنی احتیاط کی کیا ضرورت ہے۔“ فریدی بولا۔

”ٹرک کی دیواریں کافی اونچی ہیں اور ستون ان کی سطح سے نیچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ نہیں

گر سکتے۔ پھر یہ احتیاط۔“

”ہاں..... یہ چیز واقعی غور طلب ہے۔“ حمید بولا۔

”کیا خیال ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس انبار کے نیچے کچھ معلوم ہوتا ہے۔“

”بہت ممکن ہے۔“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیوں نہ انہیں روک کر تلاشی لی جائے۔“

”اجتہاد ہوئے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمیں اس کا حق کب پہنچتا ہے۔ اس قسم کی دوا

میں اسی صورت میں کرتا ہوں جب سارے جائز ذرائع ختم ہو جاتے ہیں۔ دیکھو شروع سے خیال ہے کہ ڈاکٹروں کی تجربہ گاہ اور ستونوں کے کارخانے میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔“

”اس کی وجہ۔“

”اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان دونوں عمارتوں میں بظاہر کوئی تعلق معلوم نہیں ہوا

”یعنی.....!“

”آٹھ دس میل کے رقبے میں ان دونوں عمارتوں کے علاوہ اور آبادی نہیں ہے۔“ فر

نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایسی صورت میں دونوں عمارتوں کے مینیوں کے ایک دوسرے

کچھ نہ کچھ تعلقات تو ہونے ہی چاہئیں۔“

”ضروری نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”انسانی فطرت کے لئے قطعی ضروری ہے۔“

”تو آپ مفروضات پر اپنی منطق کی دیوار کھڑی کرنی چاہتے ہیں۔“

”ہر قسم کی تحقیق مفروضات اور تشکیک ہی سے شروع ہوا کرتی ہے۔“ فریدی نے کہا

”میں نے اپنے ایک خیال کا اظہار کیا ہے اور یہ دیکھنا تو بعد کی بات ہے کہ اس میں چائی کا

نک ہے۔“

”خیر صاحب معلوم ہو گیا کہ مہینوں سر مارنا پڑے گا۔“ حمید بے دلی سے بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ ایک ہی گھنٹے میں ساری گتھیاں سلجھ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سال

میں بھی کچھ نہ ہو سکے۔ سراغ رسانی کا انحصار تو محض اتفاقات پر ہے۔“

”اچھا اچھا ذرا کار کی رفتار کم کیجئے۔“ حمید بولا۔ ”ٹرک شائد اگلے موڑ پر گھومے گا، اس

نڈم ہوگئی ہے۔“

فریدی نے کار کی رفتار کم کر دی۔ حمید کا کہنا سچ نکلا۔ ٹرک اسی طرف مڑ گیا لیکن اس کی

نڈم ہی رہی۔ پہلے کی نسبت اب وہ ٹرک کے کنارے جارہا تھا۔ کار کو راستہ دینے کے لئے۔

”دیکھا شائد انہیں شبہ ہو گیا ہے۔ بہر حال ہمیں اب گاڑی آگے نکال لے جانی چاہئے۔“

فریدی نے کہا۔ ”تم پچھلی سیٹ پر چلے جانا۔ ابھی نہیں، مجھے گاڑی آگے نکال لے جانے دو۔

ل پر نگاہ رکھنا۔“

فریدی اپنی کار ٹرک کے قریب سے نکال لے گا۔ حمید پچھلی سیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ پشت پر

لہوئے ششے سے وہ ٹرک کو دیکھ رہا تھا۔ ٹرک رک گیا۔

”ٹرک رک گئی۔“ حمید بولا۔

”وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں ہم پر شبہ ہو گیا ہے۔“ فریدی نے کہا اور کار کی

نڈم کر دی۔ چند لمحوں کے بعد ٹرک حمید کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

”یہ ٹرک کہاں جا سکتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”میں کیا جانوں۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ شہر میں کسی بیوپاری کے یہاں جائے گا۔“

”ممکن ہے۔“ حمید بولا۔

”کیفے ڈی فرانس کے سامنے ایک فرم ہے۔ بہت ممکن ہے یہ ستون وہیں جارہے ہوں۔“

”بہر حال اگر ہم کیفے ڈی فرانس میں لانچ کھائیں تو کیا حرج ہے۔“

”بھلا کھانے پینے میں کہاں ہرج ہو سکتا ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”مجھے کوئی امید نہیں۔ لیکن خیر ممکن ہے میرا قیاس صحیح نکلے۔“ فریدی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کیفے ڈی فرانس کے سامنے پہنچ گئے۔ فریدی نے اپنی کار آئد فر لاگ

بیچے کی فٹ پاتھ سے لگا دی۔ کیفے میں وہ ایک کھڑکی کے پاس والی میز پر بیٹھے۔ یہاں سے وہ

باہر کی طرف براہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ سامنے ہی میسرز جی۔ ایم استھانا خیموں کے تاجر کا گودام

تھوڑا سا گودام کے احاطے میں جا بجا بانسوں اور بلیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

فریدی نے لُچ کا آرڈر دیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد حمید کے چہرے پر اکثر ہنر آتا رہا جانے لگے۔

”شہر میں اور بھی بیوپاری ہوں گے۔“ حمید نے کہا۔ ”کیا یہ ضروری ہے کہ وہ آئے۔ قطعی ضروری نہیں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے متعلق مجھے یقین ہے۔ ہم تو دراصل یہاں محض لُچ کھانے آئے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی کام کی بات ہو جائے تو کیا کہنا۔“

”ارے.....!“ حمید جو سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا چونک کر بولا۔ ”سچ کچ رہا ہوں؟“

”اب فرمائیے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”ٹرک جیسے ہی احاطے میں داخل ہوا دو تین مزدور ادھر ادھر سے دوڑ پڑے۔ فریدی لُچ ختم کر چکے تھے۔ فریدی نے بل ادا کیا اور دونوں کینے سے نکل آئے۔ گودام کے احاطے قریب ایک پان والے کی دکان تھی۔ حمید وہاں سے سگریٹ خریدنے لگا۔

مزدوروں میں اچھی خاصی ٹکرا شروع ہو گئی تھی۔ وہ مزدور جو ٹرک کا مال اتارنے کے دوڑے تھے اس بات پر مصر تھے کہ وہ ہی ان ستونوں کو ٹرک پر سٹے اتاریں گے۔ لیکن ڈرائیور اس بات سے روک رہا تھا۔ ان کے بجائے ٹرک پر بیٹھے ہوئے گورکھوں نے ستون اٹا کر گودام کے اندر لے جانے شروع کر دیئے تھے۔

”واہ بھیا..... یہ بھی کوئی بات ہے۔ سارا دن تو مال ہم نے ڈھویا۔“ ایک مزدور ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”اور اب اس وقت تم اپنے مزدور لائے ہو۔“

”مالک کا یہی حکم ہے۔ میں کیا کروں۔“ ڈرائیور بولا۔

”اچھا حکم ہے۔“ مزدور نے کہا۔ ”اگر یہی بات ہے تو اب ہم کسی مال میں ہاتھ نہ لگائیں گے۔“

”تو یہ سب تم مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو۔“ ڈرائیور بولا۔ ”منیجر سے جا کر کہنا۔“

”اس سے پہلے جو مال لائے تھے اسے آخر ہم نے ہی تو اتارا تھا۔“ ایک مزدور نے کہا۔

”اتارا ہو گا پھر میں کیا کروں۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

بالآخر ٹکرا اتنی بڑھی کہ خود منیجر کو آفس سے نکل کر آنا پڑا۔ اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر مزدوروں کو الگ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک خالی ہو گیا۔

”اس میں تو کچھ بھی نہ تھا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ اب یہاں سے ہٹ چلیں۔“ فریدی نے کہا۔

دونوں اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ فریدی نے کار اشارت کر دی۔

”خواہ مخواہ بھاگ دوڑ کرتے رہے۔“ حمید نے کہا۔

”خواہ مخواہ کیوں؟“

”کیا ٹکرا میں۔“

”یہ تو اور دلچسپ بات ہے۔“

”اپنی دلچسپیاں بس آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”خاکسار کے تو خاک بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“

”مزدوروں کی ٹکرا سے تم نے کیا اندازہ لگایا۔“

”بس ٹکرا تھی۔“

”لیکن لایعن نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ اس سے پہلے بھی اس ٹرک کا مال اتار چکے تھے آخر اس بار انہیں اس سے کیوں محروم رکھا گیا۔“

”اچھا اب گھر چلے.....!“ حمید نے اکتا کر کہا۔

گھر پہنچ کر فریدی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور کبھی کبھی وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اسی دن دس بجے رات کو وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے کار نکالی اور ایک طرف چل پڑا۔ وہ یوں ہی بلا مقصد شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے وہ کرنل سعید کے بنگلے کے پاس سے گزرا۔

اگلے لے جا کر کار کھڑی کر دی۔ پھر تین بار انجن کھولا اور بند کیا۔ غالباً یہ کسی قسم کا اشارہ تھا۔ جب پر ایک آدمی تاریکی سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کنارے کے پاس آیا۔

”انکسٹر صاحب۔“ آنے والے نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ بیٹھ جاؤ.....!“

وہ فریدی کے برابر بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔

”کوئی خبر.....!“

”گیارہ بجے رات وہ کہیں گئی ہے۔“

”اکیلے.....!“

”نہیں۔“

”کون تھا اس کے ساتھ۔“

”ایک آدمی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں اسے پہچانتا نہیں۔“

فریدی نے اپنی جیب سے دو تین تصویریں نکال کر اسے دیں۔

”ان میں سے کوئی تھا۔“ فریدی نے کہا۔

وہ آدمی نارچ کی روشنی میں تصویر دیکھنے لگا۔

”یہ تھا..... سو فیصدی یہی تھا۔“ اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہوں.....!“ فریدی نے کہا اور تصویریں لے کر جیب میں رکھ لیں۔

”کوئی اور بات۔“ فریدی نے بوجھا۔

”اور کچھ نہیں۔“

”کرنل کی بیوی پر کسی خاص پریشانی کے اثرات۔“

”میں اسے زیادہ قریب سے نہیں دیکھ سکا۔“

”اچھا.....!“ فریدی نے کار کو پھر کرنل سعید کے بنگلے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”ابھی تمہارا کام ختم نہیں ہوا..... تمہیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ کب اور کس حالت میں گھر

واپس آتی ہے۔“

”بہت اچھا۔“

”یہ لو۔“ فریدی نے اس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کا خرچ۔“

ایک عجیب اتفاق

حمید بے خبر سو رہا تھا۔ فریدی نے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

”خیریت..... خیریت۔“ حمید نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی نظر گھڑی کی طرف گئی۔

”اف فوہ..... ابھی تو تین ہی بجے ہیں۔“ حمید نے فریدی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کن کی آفت آگئی۔“

”کچھ نہیں..... چوہے کے بل سے جو ہاتھی نکلا ہے تمہیں دکھانا چاہتا ہوں اور اسی وقت

ہیں اس کا مہادت بھی بناؤں گا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”یعنی.....!“

”آؤ میرے ساتھ۔“ فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے۔ انہیں ستونوں میں سے ایک جو انہوں نے ٹوک پر

دیکھتے تھے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

”کیا خیال ہے۔“ فریدی حمید کی طرف دیکھ کر بولا۔

”خواہ مخواہ میری نیند خراب کی۔“ حمید بڑبڑایا۔

”کیا تم مجھے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ میں خواہ مخواہ اسے لا دوں گی یا لاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”تو کچھ بولنے بھی نا۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”تم سننے کب ہو۔“

”اچھا سن رہا ہوں۔“

”کیا تم اسے بانس کا بنا ہوا سمجھتے ہو۔“ فریدی نے ستون کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”کی نہیں..... میرا خیال ہے کہ یہ خالص سونے کا بنا ہوا ہے۔“ حمید طنز پر لہجے میں بولا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ذرا اسے قریب سے دیکھو.....

ماکی مصنوعی گانٹھوں پر نہ جاؤ.....“ حمید جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

”واقعی کمال کر دیا۔“ حمید اٹھ کر بولا۔ ”لیکن آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، اس صنعت گری کو جرم کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر شیشم کی لکڑی کا ستون ایسا بنایا گیا جو ہمارے معلوم ہو تو کون سی مصیبت آگئی۔ واقعی کاریگر نے کمال کر دیا ہے۔“

”لیکن یہ کمال دکھانے کی ضرورت..... ظاہر ہے کہ انہیں غمناش میں تو جانا نہیں ہے فریدی نے کہا۔

”ہوگا صاحب کچھ۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔ ”آپ تو خواہ مخواہ ہر چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اچھا اب اگر واقعی تم اس کمال کو دیکھنا چاہتے ہو تو وہ گلاس اٹھاؤ۔“ فریدی نے کہا۔ ستون کو اٹھا کر زمین پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ سرے پر لوہے کے رنگ چڑھ گئے۔ فریدی نے انہیں گھمانا شروع کر دیا، دوسرے ہی لمحے میں رنگ ایک دھکن سے ستون سے الگ ہو گئے اور کوئی سیال شے ستون سے نکلنے لگی۔

”ارے.....!“ حمید اچھل کر بولا۔

”گلاس لگاؤ.....“ فریدی نے کہا اور ستون کو جھکا دیا۔ گلاس بھر گیا۔ حمید حیرت سے اسے منہ دیکھ رہا تھا۔

”کیوں قبہ حمید صاحب کتنی نفیس شراب ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”اگر کوئی ہرج نہ تھوڑی سی پچھ کر دیکھئے۔“

حمید نے گلاس منہ میں لگا کر ہلکی سی چسکی لی۔ فریدی نے دھکن بند کر کے ستون کو اُگے میں کھڑا کر دیا۔

”واقعی بہت عمدہ ہے۔“ حمید بولا۔ ”مگر یہ دیسی تو نہیں معلوم ہوتی۔“

”سو فیصدی دیسی ہے.....!“ فریدی نے کہا۔ ”کہئے چوہے کے بل سے ہاتھی نکالایا نہیں۔“

”مانتا ہوں استاد۔“ حمید نے کہا۔ ”اب مجھے اس کیس میں کچھ کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔“

”یہ آپ کو بل کیسے گیا۔“

”کانی پاؤں بیٹنے پڑے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ مجھے سو روپے میں ملا ہے اور جو فلا مول لینے پڑے ہیں وہ الگ ہیں۔“

”یعنی.....!“ حمید نے کہا۔

”چوکیدار کو سو روپیہ رشوت دینی پڑی۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک ستون کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ صبح کو وہاں سے خریدا جاسکتا ہے۔ میں نے سو روپیہ کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی میری حماقت پر، کہ میں ایک ستون کے لئے اسے دو روپے دے رہا ہوں غالباً اسے کچھ شبہ ہو گیا تھا۔ ابھی ہم لوگ اس گفتگو میں مشغول ہی تھے کہ

ہاں ایک ٹرک آ کر رکھا، میں جلدی سے چھپ گیا۔ اس پر سے دو آدمی اترے۔ چوکیدار نے انہیں سلام کیا اور وہ اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ ستون ڈھورے ہیں۔ انہوں نے چوکیدار کو بھی مدد کے لئے بلالیا۔ چوکیدار کو میں نوٹ دے چکا تھا۔ میں نے واقعی یہ ایک زبردست حماقت کی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ نہ تو اس نے میرے غائب ہونے پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ان لوگوں سے میرے متعلق کچھ کہا۔ وہ لوگ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے۔ چوکیدار نے مجھے چھپتے دیکھ لیا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آکر آہستہ سے بولا۔ ”کہ میں ان لوگوں کو باتوں میں لگاتا ہوں تم ٹرک میں سے ایک ستون اٹھا لے جاؤ اس طرح میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“

”اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید بولا۔

”گھسیارہ بننے کا۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

حمید ہنسنے لگا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہم لوگ گھسیاروں کے بھیس میں جھریالی بنیں گے۔“

”آخر اس کی ضرورت۔“ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ستون بنانے والے کارخانے میں اصل شراب بنتی ہے۔ اگر ہم نے انہیں دھوکے میں ڈال کر چھاپا مارا تو وہاں سے کوئی چیز ہٹا سکیں گے لہذا خود بخود گھاس چھیلنے سے کیا فائدہ۔“

”میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے دونوں عمارتوں کا تعلق دریافت کرنا ہے۔ اگر ہم نے اس سے قبل چھاپہ مارا تو ہمارا یہ حملہ ادھورا ہوگا اور شاید ناکام بھی۔“

دونوں نے اپنے اپنے منہ پھیر لئے۔ حمید پر رہ رہ کر جھلاہٹ سوار ہو رہی تھی۔ آخر اس جانت کی کیا ضرورت تھی۔ مگر وہ بول ہی کیا سکتا تھا۔ کیونکہ بعد میں اسی کو احق بننا پڑتا تھا۔ خیسے کہ تنوں ہی کے معاملے میں اسے کافی خفت اٹھانی پڑی تھی۔ اس لئے فریدی کی اس اسکیم میں زیادہ دخل در معقولات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ آہستہ آہستہ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کا کافی سامان لائے تھے۔ فریدی نے یہ طے کیا تھا کہ اگر دن میں کوئی خاص بات نہ معلوم ہو سکی تو وہ حمید کو گھوڑے گاڑی پر گھاس کے گٹھروں کے ساتھ شہر روانہ کر دے گا اور خود رات کو وہیں رہ کر کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔

دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا۔ حمید بُری طرح تھک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی بایں دوڑ گئی تھی اور آنکھوں کے گرد دنیا لے رنگ کے حلقے نظر آنے لگے تھے۔ اس کے برخلاف فریدی کے چہرے کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دفعتاً اس نے حمید کو آواز دی۔ حمید بے دلی سے تقریباً گھسٹا ہوا اس تک پہنچا۔

”کیا آج ختم ہی کر دینے کا ارادہ ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”گھبراؤ نہیں..... شاید اللہ تم پر بہت زیادہ مہربان ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”ہوگا صاحب..... یہ بتائیے کہ آپ نے مجھے بلایا کیوں ہے۔“

”ادھر دیکھو۔“ فریدی نے ایک گڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ گڑھا شاید برساتی پانی کے ریلے کا نتیجہ ہے۔“

”دیکھ لیا۔“ حمید نے جواب دیا۔

”کیا دیکھا.....؟“

”اللہ کی رحمت! فرشتے نظر آرہے ہیں۔ اس چھوٹے سے گڑھے میں دنیا آباد ہے۔“
 نقلت کا اثر دھام ہے۔ کہیں مٹھائی والوں کی دکانیں ہیں، کہیں کٹورے خنک رہے ہیں، لکھنؤ کے بانگے تھپتھپا لگائے آئینہ بند ادھر ادھر فرمستیاں کرتے پھر رہے ہیں، مک چرس اور گانجے کی دکانوں پر کافی بھیڑ ہے، ذرا بڑھ کر دیکھتے تو کہیں یہ کم بخت بغیر لائسنس کی چرس تو نہیں فروخت کر رہا ہے۔

دوسرے دن صبح جھریالی میں ستونوں کی فیکٹری اور ڈاکٹروں کی تجربہ گاہ کے درمیان دو گھسیارے گھاس چھیل رہے تھے۔ قریب ہی ایک ٹوٹی پھوٹی سی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی جس پر وہ گھاس لادنے کے لئے لائے تھے۔ یہ دونوں حمید اور فریدی تھے۔

”ٹھیک ہی کہا تھا اس نجوی نے۔“ حمید نے گھاس چھیلتے چھیلتے سراٹھا کر کہا۔

”کیا کہا تھا.....!“ فریدی نے پوچھا۔

”یہی کہ تم بی اے پاس کر کے گھاس چھیلو گے۔“ حمید نے کہا۔ ”آج میں اس کا معتقد ہو گیا۔“ اور میں شروع سے معتقد تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”آپ کو کیا معلوم۔“

”تم نے اس محکمے میں گھاس چھیلنے کے علاوہ آج تک اور کیا ہی کیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ میرا عظیم ترین کارنامہ ہے کہ میری وجہ سے آپ اتنے مشہور ہو گئے۔ دنیا سمجھتی ہے کہ

یہ سارے کارنامے آپ کے ہیں۔ لیکن اب سے سو سال کے بعد کوئی نہ کوئی نیک نفس اس حقیقت پر سے پردہ ضرور اٹھا دے گا جس طرح شیکسپیر کے ڈراموں کی حقیقت واضح ہو گئی ہے ڈرامے لکھے بے چارے فرانس بیکن نے اور نام شیکسپیر کا ہوا۔ اب ایک امریکن صاحبزادہ نے نیا انکشاف کیا ہے وہ کہتا ہے کہ بیکن نے نہیں بلکہ مارلے نے لکھے ہیں۔ اسی طرح سوسال کے بعد میرا نام ہوگا اس کے بعد کوئی اللہ کا بندہ یہ ثابت کر دے گا کہ فریدی کے کارنامے حمید نہیں بلکہ انسپٹر جگدیش کے رہیں منت ہیں۔“

”گھاس چھیلو میاں گھاس۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اوقات پر رہو۔ شیکسپیر بیکن اور مارلے

تذکرہ کرنے سے کیا فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ واقف رکھتے ہو یا پھر شاید تم اسی گھوڑے پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم دراصل گھسیارے بنو بلکہ گرجو بیٹ ہو۔“

”عزت افزائی کا شکریہ۔“ حمید نے کہا۔

”خیر..... خیر..... چھوڑو ان باتوں کو اب کیا دن بھر گھاس ہی چھیلنے رہیں گے۔“

فریدی نے کہا۔ ”تم فیکٹری کی طرف بڑھو اور میں تجربہ گاہ کی سمت لیتا ہوں۔“

فریدی خاموشی سے سنتا رہا۔ حمید کے چپ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔
”بک چکے۔“

”ابھی کہاں۔“ حمید نے کہا۔ ”ابھی تو تمہید تھی۔ اب شروع کرتا ہوں۔ جانا صاحب زماں کا طرف شہر بیسراں کے اور مارنا عتیق دیا پرورد کا اور زخمی ہونا لندھور بن سعد ان کاہ سے پیر زادہ عبدالادج بن عشق سلمہ کے اور عشق بنانا.....!“

فریدی نے اٹھ کر حمید کی گردن پکڑ لی۔

”اب ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نکلا اور میں نے تمہارا سر زمین پر مارا۔“ فریدی۔
کہا اور اس کا منہ دبایا۔

”اچھا چپ ہو گیا۔“ حمید نے فریدی کی گرفت سے نکل کر کہا۔ ”بتائیے کیا بات ہے۔“
”اس گڑھے میں ایک موٹا سا پائپ گڑا ہے۔“

”پائپ.....!“ حمید نے گڑھے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں..... ہاں..... ہے تو“
”اس کا مطلب.....!“ فریدی نے استغہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھلا پائپ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔ لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہو کر کہنے لگا
”واقعی یہاں اس ویرانے میں پائپ کا کیا مطلب۔“

”میونسپلٹی کی پائپ لائنوں کا نقشہ میرے ذہن میں ہے۔“ فریدی نے کہا ”اور پھر جس شہر سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ان دونوں عمارتوں کے لئے تو میونسپلٹی پائپ دینے سے رہی۔“

”پھر.....؟“

”کچھ نہیں..... ان دونوں عمارتوں کا تعلق ظاہر ہو گیا۔“

”یعنی.....!“

”ڈاکٹروں کی تجربہ گاہ میں شراب تیار ہوتی ہے اور پھر اسے اسی پائپ لائن کے ذریعہ فیکٹری میں پہنچایا جاتا ہے۔“

”ارے.....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”مگر اس کا ثبوت کیسے ہم پہنچائیں گی۔“

”جی کے لئے میں آج رات کو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

حملہ

دوسرے دن فریدی گھر پہنچا اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر گہری گہری خراشوں کے نشان نہ بکڑے پھٹ گئے تھے۔ سر کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ حمید اسے اس حال میں دیکھ کر گہرا گیا۔

”یہ کیا ہوا۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”کچھ نہ پوچھو، دو خطرناک کتوں سے بڑی سخت جنگ کرنی پڑی۔“ فریدی نے جواب دیا۔
”تو کیا آپ تجربہ گاہ میں گھس گئے تھے۔“

”اس کا موقع ہی کہاں ملا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اپنے کچھ کتے باہر بھی چھوڑ دیتے۔“
”جرات بھر جھریالی کے سنان علاقے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ رات ہوتے ہی میں ٹیلوں کے درمیان چھپ گیا تھا۔ خیال تھا کہ بارہ بجے کے بعد عمارت میں گھسنے کی کوشش کروں گا، مگر ان کتوں نے وہیں آلیا، انہیں مار بھی نہیں سکتا۔ ورنہ بیسول تو تھا میرے پاس۔ گولی چلنے کی ضرورت نہیں ہو شیار کر دیتی۔“

”خیر اب آپ آدمی بننے..... اس کے بعد اس کے متعلق کچھ سوچا جائے گا۔“ حمید نے کہا۔
فریدی نے غسل کر کے لباس تبدیل کر لیا۔ حمید نے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ ناشتہ کرنے کے بعد دونوں لائبریری میں آ بیٹھے۔

”اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اب چھاپہ مارنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا۔ رات کو چھپ چھپ کر تو وہاں جانا ہی ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کے کتے بہت خطرناک ہیں۔ چھاپہ مارنے کی صورت میں بھی ہمیں اپنا امتیاز سے کام لیتا پڑے گا، اگر انہوں نے وحشی درندوں کو کھول دیا تو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کم از کم ایک سو مسلح سپاہیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ فیکٹری اور

”یہ نہیں صاحب..... اس کی تو کوئی بات ہی نہیں۔“ جگدیش نے کہا۔ ”اس پر لکڑی کے ٹکڑے ہوئے تھے جن میں شراب بھری تھی۔ ٹرک اٹنے سے کئی گٹھے ٹوٹ گئے، اور شراب چلی۔“

”ٹرک پر کتنے آدمی تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”صرف ڈرائیور تھا، وہ اسی وقت مر گیا۔“

”ٹرک کس کا تھا۔“

”یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔“

”کیوں، کیا نمبر کے ذریعے یہ نہیں لگ سکا۔“

”اس نمبر کا کوئی ٹرک اس شہر میں آج تک رجسٹرڈ نہیں ہوا۔“

”ڈرائیور کے متعلق معلوم ہو سکا کہ وہ کون ہے۔“

”نہیں..... یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔“

”اس کا حلیہ یاد ہے۔“

”جی ہاں۔“

”پھولی ہوئی ناک تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں..... لیکن..... کیا آپ نے دیکھا ہے۔“

”گھنی اور چڑھی ہوئی مونچھیں..... ایک کا اوپری حصہ تھوڑا سا کٹا ہوا، بائیں گال پر ایک

اسا انچرا ہوا اس۔“

”بالکل یہی..... سو فیصدی یہی.....!“ جگدیش بے صبری سے بولا۔

”میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”اور یہ بھی جانتا ہوں کہ

ٹراب کہاں بنتی ہے، اور کہاں سے تقسیم ہوتی ہے۔“

”اوہ.....!“

”تو کیا تم انہیں پکڑنا چاہتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ جگدیش چپک کر بولا۔

تجربہ گاہ دونوں پر بیک وقت چھاپہ مارا جائے۔“

”واقعی وحشی درندوں کا مقابلہ بڑا خطرناک ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر وہ آزاد ہو

قیامت ہی آجائے گی۔ وہاں شیر بھی ہیں۔ میں نے اس دن بھی شیروں کے دھاڑنے کی

سنی تھی۔“

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ہمیں اس عمارت کی طرف

سے روک کیوں دیا تھا؟ وہاں سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز ضرور آئی تھی۔ لیکن یہ تو سو

انہیں ان کمروں میں کھانا وغیرہ کس طرح دیا جاتا ہوگا۔ دروازے یقیناً کھولنے پڑتے ہو

اور یہ چیز کھانا دینے والوں کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ چیز قطعی نہیں آ

”واقعی یہ بات قابل غور ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”بند کمروں میں شیروں کو رکھنا ناممکن

پھر کیا بات ہے۔“

”جو بات بھی ہے غمگین ظاہر ہو جائے گی۔“ فریدی نے کہا۔ ”بہر حال ہمیں اس

خیال رکھنا پڑے گا کہ اندر پہنچتے ہی کسی طرح شیروں والی عمارت پر قبضہ کر لیں۔“

”جگدیش سے گفتگو کی جائے۔“ حمید بولا۔ ”پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اتنا

کر سکے گا یا نہیں۔“

فریدی اور حمید کو توالی جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ خود جگدیش وہاں آ گیا۔

”کہئے جناب کیا کوئی نئی مصیبت۔“ جگدیش نے کہا۔ ”آج ایس۔ پی صاحب

زیادہ برہم ہیں۔“

”کیوں.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”ارے صاحب نہ جانے کیوں آج کل یہاں وارداتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔“

”کوئی نئی واردات ہوئی کیا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں..... کل رات کو کلائیورڈ پر ایک ٹرک الٹ گیا۔“

”تو اس میں ایس۔ پی صاحب کے بگڑنے کی کیا بات ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ٹرک اٹنے کی ذمہ دار پولیس تو ہو نہیں سکتی۔“

”بھلا بھائی جگدیش صاحب ڈی۔ ایس۔ پی بننے کی فکر نہ کریں گے۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔
 ”نہیں بھائی ابھی اس کی اہلیت مجھ میں نہیں پیدا ہوئی۔“ جگدیش نے کہا۔
 فریدی نے سارا ماجرا جگدیش سے بیان کر دیا اور اسے اپنی اسکیم بھی بتائی۔ جگدیش اسی کے خیال کے مطابق انتظامات کرنے کا وعدہ کیا۔
 جگدیش کو رخصت کرنے کے بعد فریدی تہہ خانے میں آیا۔ کرنل سعید بہت زیادہ غصہ نظر آ رہا تھا۔

فریدی کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔
 ”کیا مجھے عرقید کی سزا دی گئی ہے۔“ وہ غرا کر بولا۔
 ”گھبرائیے نہیں کرنل صاحب، آپ بہت جلد چھوڑ دیئے جائیں گے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”اس وقت میں آپ سے ایک بات دریافت کرنے آیا ہوں۔“

کرنل سعید کچھ بولنے کے بجائے فریدی کو گھورتا رہا۔
 ”میں ڈاکٹر وحید کی تجربہ گاہ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
 ”میں کچھ نہیں جانتا۔“
 ”دیکھئے کرنل صاحب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر کہئے تو میں آپ کو وہ انکوائری والی دو لادوں..... مگر یہاں آپ کے لئے کتنا مہیا کر سکوں گا۔“

کرنل سعید چونک پڑا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 ”ڈاکٹر وحید کا وہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اب آپ پھر سے جوان ہو سکیں گے۔“
 دیکھئے اب کوئی دوا چاہیے گا نہیں۔“
 ”تم آخر چاہتے کیا ہو۔“ کرنل عاجز آ کر بولا۔
 ”ڈاکٹر وحید کی تجربہ گاہ کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچانا چاہتا ہوں۔“
 ”کیا.....!“

”وہاں کتنے وحشی درندے ہیں۔“
 ”دیکھئے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ شیروں کی گرج ضرور سنی ہے۔“ کرنل سعید نے کہا۔

”کیا ڈاکٹر وحید آپ کے گھر بھی آتا تھا۔“
 ”ہاں..... آتا تھا۔“
 ”کیا اسے اس بات کی اطلاع تھی کہ آپ کہیں باہر جانے والے ہیں۔“
 ”سب کی بات پوچھ رہے ہو۔“ کرنل سعید نے کہا۔
 ”آپ کی لڑکی کی گمشدگی کے زمانے کے قریب کی۔“
 ”ہاں، اس دن یاد آیا، وہ آیا تھا۔ شاید میں نے اس سے تذکرہ بھی کیا تھا کہ میں باہر جا رہا ہوں۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔“
 ”بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ کب سے اس کے زیر علاج تھے۔“
 ”تقریباً چھ ماہ قبل سے۔“
 ”اچھا شکریہ۔“ فریدی نے کہا۔ ”معاف کیجئے گا..... میں نے آپ کو یہاں لا کر تکلیف دی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو آپ اپنے ہی کسی کتے کا شکار ہو جاتے اور اپنی ہوس کا شکار تو آپ ہی ہو گئے۔ کیوں جناب جب آپ اس قابل ہی نہیں تھے تو کسی جوان عورت سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”میں بیہودگی پسند نہیں کرتا۔“ کرنل سعید گرج کر بولا۔
 ”لیکن شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ ابھی آپ کو ایک ایسی بیہودگی کا سامنا کرنا پڑے گا کہ آپ زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگیں گے۔“ فریدی نے کہا اور تہہ خانے سے چلا آیا۔
 اسی دن شام کو جگدیش نے چاہے مارنے کے سارے انتظامات مکمل کر لئے۔ احتیاطاً ایک مشین گن بھی لے لی گئی تاکہ ضرورت پڑنے پر وحشی درندوں کا حملہ روکنے کے کام آئے۔
 انڈیا ہوتے ہی پولیس کی لاریاں جھریالی کی طرف روانہ ہو گئیں۔ تجربہ گاہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر لاریاں روک دی گئیں۔ پولیس کے جوان تاریکی میں آہستہ آہستہ دونوں عمارتوں کی طرف بڑھنے لگے۔ پولیس والے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے تھے ایک ٹولی کا رخ فیکٹری کی طرف تھا اور دوسری کا تجربہ گاہ کی طرف۔ تجربہ گاہ کی طرف جانے والی ٹولی کی قیادت فریدی کر رہا تھا اور دوسری عمارت کی طرف بڑھنے والے حمید کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

ہنڈل سے شعلہ نکلا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی دوسرے آدمی پر تھا جو اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی جدوجہد کے بعد فریدی نے اسے قابو میں کر لیا۔ فریدی نے اس کی کنپٹیوں پر اتنے گھونے مارے کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے وہیں چھوڑ کر وہ مشینوں والے کمرے میں آیا جیب سے ٹارچ نکال کر روشنی کی۔ مشین پر ہنڈل چل رہی تھی۔ کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا جس کی وجہ سے پوری عمارت کی روشنی گل ہو گئی۔ فریدی نے سوئچ آن کر دیا۔ عمارت پھر جگمگانے لگی۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گولی چلی آوازیں آرہی تھیں۔ فریدی نے برآمدے میں آکر بیہوش آدمی کو دیکھا۔ یہ ڈاکٹر وحید تھا۔ وہ شخص جو اس کے ریوالور سے زخمی ہو کر گرا تھا، اس کا ساتھی ڈاکٹر آصف تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹروں کے آدمیوں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ادھر حمید والی نے فیکٹری پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں بھی کچھ آدمی تھے جنہیں گرفتار کر لیا گیا۔

ایک فاحشہ

”دوسرے دن شام کو انسپکٹر فریدی، سرجنٹ حمید اور کو توالی انچارج جگڈ لیش آرچو میں بیٹھے بائیں پارے تھے۔“

”ہاں یہ تو بتائیے۔“ جگڈ لیش نے فریدی سے کہا۔ ”کرنل سعید کی بیوی کا کیا قصہ ہے۔“

”بہت معمولی..... کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ ایسی حالت میں عموماً جوان عورتیں جو کچھ کرتی ہیں وہی اس نے بھی کیا۔ کرنل سعید ڈاکٹر وحید کے زیر علاج تھا۔ اس دوران میں ان ہنڈل میں کافی بے تکلفی بڑھ گئی۔ ڈاکٹر وحید کرنل سعید کے یہاں آنے جانے لگا۔ ڈاکٹر وحید جوان اور خوبصورت تھا کرنل سعید بوڑھا کھوسٹ۔ اس کی بیوی اور ڈاکٹر وحید میں ناجائز تعلق

تجربہ گاہ کی دیواروں کے قریب پہنچے ہی کچھ سپاہیوں نے عمارت کا محاصرہ کر لیا اور فریدی اور کچھ جگڈ لیش کے ساتھ صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ صدر دروازہ ابھی کھلا تھا۔ چونکہ دروازہ کھلا رہا تھا۔ فریدی پیچھے سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے منہ سے آواز نکلا۔ ”اسکی، اس سے فرصت پانے کے بعد فریدی دوڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ اسی کے ساتھ پولیس والے بھی گھسے۔ اندر پہنچتے ہی انہوں نے بے تحاشہ فائر کرنے شروع کر دیے۔ فریدی نے جلد سے اس عمارت کی طرف پہنچ جانا مناسب سمجھا جہاں وحشی درندے تھے۔ وہ جلد ہی اپنے مقصد کا میاب ہو گیا۔ عمارت کے مکین اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہ تھے۔ پہلے تو وہ یقیناً گھبراہٹ میں پھر انہوں نے بھی جوابی فائر کرنے شروع کر دیے۔ دو ایک نے دیواروں پر چڑھ کر اپنے کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن باہر کھڑے ہوئے جوانوں نے انہیں باندھ لیا۔ ڈاکٹروں کے آدمیوں نے باقاعدہ مورچے بنائے تھے۔ وہ کمروں سے فائر کر رہے تھے۔ دفعتاً ساری عمارت کی روشنیاں گل ہو گئیں۔ فریدی کو پہلے ہی سے اس کی توقع تھی اس لئے اس نے صدر دروازہ پر کچھ آدمی چھوڑ دیئے تھے۔ روشنی گل ہوتے ہی وہ ہوشیار ہو گئے۔ فریدی آہستہ آہستہ ریٹکتا اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں بجلی پیدا کرنے کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں آدمی گھبرائی ہوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

”لیکن اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے ہمارے آدمیوں کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن خیر، کو بھی بچانا ضروری ہے۔“ ایک بولا۔

”مگر وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”ادھر سے جاؤ..... بغل والے کمرے کی کھڑکی سے دوسری طرف کو جاؤ۔ اس کھڑکی سے دو سلاخیں نکلی ہوئی ہیں، تم آسانی سے گزر جاؤ گے کمرے میں ادھر ہی وہ گیس رکھی ہے۔ ڈھکن کھول کر چلے جاؤ۔ تم نے یہ بڑی عظمندی کی کہ دو گیس مارک لیتے آئے..... اچھا جاؤ گیے۔“

ماسک نکالو۔ میں بھی لگائے لیتا ہوں جلدی کرو جلدی جاؤ۔“

فریدی کے لئے یہ بہت ہی خطرناک لمحہ تھا۔ اسے فوراً ہی کچھ کرنا تھا۔ اگر وہ گیس بے منتشر کرنے جا رہا تھا کوئی تباہ کن گیس ہوئی تو کیا ہوگا۔ جیسے ہی دوسرا آدمی الگ ہٹا، فریدی نے

ہو گیا۔ کرنل سعید اس سے ناواقف تھا۔ ڈاکٹر نے اسے احمق بنا رکھا تھا۔ وہ روز بروز اسے دو اکس دیتا رہا جس سے اس کی جنسیت قریب قریب بالکل مردہ ہو گئی۔ اب اسے دوبارہ بننے کا خط ہو گیا۔ کرنل سعید کا دوا چرانے والا واقعہ تو بتا ہی چکا ہوں۔ اس کے بعد کرنل جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کا علم ڈاکٹر وحید کو بھی ہو گیا، وہ اسی رات کو جھریالی سے کرنل سعید یہاں آیا..... شامت اعمال کہ کرنل کی لڑکی نے انہیں داعش دیتے دیکھ لیا..... یہ چیز ان دنوں کے لئے بڑی خطرناک تھی۔ ڈاکٹر وحید نے لڑکی کو پکڑا اور پھر اس نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ کرنل سعید کی بیوی اس پر گھبرا گئی، بڑی دیر تک دونوں سوچتے رہے کہ کیا کیا جائے۔ کرنل کی بیوی کو ایک تہذیب سوجھی، اس نے مردہ لڑکی کو ہیروں والا ہار پہنا کر ایک بورے میں کر دیا۔ ڈاکٹر وحید واپسی میں اس بورے کو کار میں رکھ کر اپنے ساتھ جھریالی لے گیا اور بورے کو جھیل میں پھینک کر مطمئن ہو گیا۔ دوسرے دن کرنل کی بیوی نے مشہور کر دیا کہ ہیروں کے ہار سمیت غائب ہو گئی تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ کسی نے ہار کے لالچ میں اسے کہیں ڈال دیا ہوگا۔

”تو اس نے ان سب باتوں کا اقرار کیا ہے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”ہاں..... جیسے ہی میں نے جب سے وہ ہار نکال کر اسے دکھایا، وہ غش کھا کر گر پڑا پھر ہوش میں آنے کے بعد اس نے اقبال جرم کر لیا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کرنل سعید کو کیا ہو گیا۔“ جگدیش نے کہا۔

”یہ معمہ تو میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”شیروں والا معمہ بھی ابھی تک حل نہیں ہوا۔ وہ عمارت تو بالکل خالی تھی جس کے

آپ لوگوں نے کہا تھا کہ وہاں وحشی درندے ہیں۔“

”بہر حال یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ شراب کشید کرنے کا کارخانہ اس عمارت میں کھلا لوگوں کے چلے آنے کے بعد میں نے شیروں کی گرج کا راز بھی دریافت کر لیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس کوئی وحشی درندہ نہیں تھا۔ اس کا اندازہ میں نے اسی وقت لگایا تھا جب میں نے ان یہاں بکرے کو چھتے کے بھیس میں دیکھا تھا اور اس کا راز ظاہر ہوتے ہی ڈاکٹر آصف بوکھلا

اور وحید جو اس سے زیادہ چالاک ہے اس کی بھونٹ سی وجہ بتا کر صاف ٹال گیا تھا، وہ دراصل اس قسم کی حرکتوں سے پبلک پر رعب ڈالا کرتے تھے کیونکہ اس عمارت میں انہوں نے شراب کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ وہ اس عمارت کی طرف کسی کو نہ جانے دیں۔ لہذا انہوں نے وہاں سے لوگوں کو شیروں کی گرج سنانی شروع کی اور یہ کہنے لگے کہ ابھی اہر جانا خطرناک ہے کیونکہ وہاں کٹھروں کا انتظام نہیں ہے۔“

”لیکن یہ گرج تو سچ گچ شیروں کی گرج معلوم ہوتی تھی۔“ حمید بولا۔

”ٹھیک ہے..... لیکن وہ شیر اس وقت کہاں مر گئے تھے جب گولیاں چل رہی تھیں۔ اس ہمارے میں تو انہیں ضرور دھاڑنا چاہئے تھا۔ لیکن اگر ڈاکٹروں کو ذرا سا بھی موقع مل جاتا تو یقین ہاں شیر ضرور گر جتے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ جگدیش نے کہا۔

”ارے بھئی وہ شیروں کی گرج کا ریکارڈ تھا، جو مائیکروفون کے ذریعہ اتنا ہولناک ہو جاتا تھا۔ انہوں نے دوسری عمارت میں کئی ہارن فٹ کر رکھے تھے۔“

”کمال کر دیا۔“ جگدیش بولا۔

”مگر یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں ایک بار اور بھی ایسے ہی ایک واقعے سے ”ہار ہو چکا ہوں۔“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”نواب رشید انڑماں کے گھر والا واقعہ تو نہیں یاد ہی ہوگا۔“

”ہاں ہاں..... وہاں بھی تو دیواروں سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی تھیں۔“

”جنگلی جانوروں کی۔“ جگدیش نے کہا۔

”ہاں..... وہاں دیواروں کے اندر لاؤڈ سپیکر کے ہارن لگے ہوئے تھے اور جنگلی جانوروں کی آوازیوں کا ریکارڈ ایک تہہ خانے سے بجایا جاتا تھا، بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے آوازیں دیوار سے نکل رہی ہوں۔“

”کمال ہے بھئی۔“ جگدیش نے کہا۔

”لیکن آپ کو کرنل کی بیوی پر شبہ کیسے ہوا۔“ حمید نے پوچھا۔

جاسوسی دنیا نمبر 11

”پہلے تو ڈاکٹر وحید کے متعلق اس کی غلط بیانی پر..... پھر میرے ایک مخبر نے مجھے اس اطلاع دی کہ کرنل سعید کے غائب ہو جانے کے بعد وحید اسے ایک رات جھریالی لے گیا تھا۔“
تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جگدیش اٹھ کر چلا گیا۔
”اب کرنل سعید کا کیا ہوگا۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ اپنی لڑکی کی موت سے بے دل شکستہ ہو گیا ہے اور اتنی بڑی بدنامی کے بعد وہ نہیں چاہتا کہ اب اس شہر میں کسی کو اپنا دکھائے۔ اس نے مجھ سے استدعا کی ہے کہ میں اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ یہاں سے کہیں اور جانا چاہتا ہے جہاں اس کا کوئی شناسا نہ ہو۔ میں آج ہی رات کو اسے شہر نکال دوں گا، اور اس کا راز ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو نہ معلوم ہونے پائے گا۔ مجھے اہ ہے کہ تم بھی میرے وعدے کا احترام کرو گے۔“ فریدی نے کہا اور یہ سہ کوئل کے پیسے دے کھڑا ہو گیا

ختم شد

پہاڑوں کی ملکہ

(مکمل ناول)

ایک انچ چوڑی ایک پیتل کی مورتی برآمد ہوئی۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ موت اسی مورتی کے نکل جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ ابھی تک لاش کا کوئی وارث نہیں مل سکا۔ یہ مورتی آثار قدیمہ کے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ اکثر کا خیال ہے کہ یہ چندر گپت موریا کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ فی الحال یہ مورتی پولیس کے قبضے میں ہے۔ یہ معرکہ کسی طرح حل نہیں ہو سکا کہ موتی نے اسے کیوں نگلا.....؟“

فریدی نے انتہائی سنجیدگی سے اس خبر کو سنا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک حمید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جو دوسری خبریں پڑھنے کے لئے اخبار کو الٹ پلٹ رہا تھا۔
”یہ لیجے میگزین سیکشن میں اس مورتی کی تصویر بھی ہے۔“ حمید نے سر اٹھا کر کہا۔ لیکن فریدی کی حالت دیکھتے ہی اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

پیتل کی مورتی

”کہئے جناب۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا آپ کی رگ جاسوسی پھڑکنے لگی؟“
”لاؤ دیکھوں وہ تصویر۔“ فریدی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ حمید نے اخبار اسے دے دیا۔ فریدی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں اور نچلا ہونٹ لال میں دب کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
حمید اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فریدی کو اس حالت میں دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا۔
”اے کی طرح جیسے کوئی کامل اور کام چور لڑکا اپنے کسی بزرگ سے کسی غیر متوقع حکم کے خیال نکل اذوقت ہی ناک بھوں سکوڑنے لگتا ہے۔“

ایشیا کا نامور جواں سال سراغ رساں انپکٹر فریدی صبح کا ناشتہ کر چکنے کے بعد ڈرا روم میں بیٹھا اپنی رائفلوں کا معائنہ کر رہا تھا سرجنٹ حمید اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔ دفتر نے قہقہہ لگایا اور فریدی چونک پڑا۔
”بڑی دلچسپ خبر ہے۔“ حمید نے کہا۔
”کیا.....؟“

”تبت کے ایک باشندے کے پیٹ میں سے ایک پیتل کی مورتی برآمد ہوئی۔“
”کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے۔“ فریدی نے کہا اور ایک آنکھ دبا کر رائل کا جائزہ لینے لگا۔

فریدی نے اخبار صوفے پر رکھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔
”یارب العالمین۔“ حمید آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔ ”اس گتھنگار کو ہر قسم کے آفات سے محفوظ رکھیو۔“
”حمید.....!“ فریدی نے کہا۔ ”کیا تمہیں یاد ہے، براؤن نے ایک مورتی کا تذکرہ کیا تھا۔“
”کون براؤن۔“

”وہی جو پچھلے سال اسکاٹ لینڈ سے یہاں آیا تھا۔“
”اؤہ..... وہ سراغ رساں چیف انپکٹر براؤن۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن میرے سامنے کسی آدمی کا تذکرہ نہیں آیا تھا۔“

”آپ مذاق سمجھ رہے ہیں؟“
”مت بکو.....!“ فریدی اکتا کر بولا۔ ”ہر وقت ٹائیس ٹائیس اچھی نہیں معلوم ہوتی۔“
”اچھا تو سنئے۔“ حمید اخبار پڑھنے لگا۔ ”رام گڑھ ۱۲ جون چوٹی بل کے نیچے صبح ہی صبح تبتی کی لاش ملی ہے۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ موتی کے معدے سے تین انچ لمبی

”اس نے ایک عجیب و غریب پیتل کی مورتی کا تذکرہ کیا تھا، جس کی وجہ سے لندن کافی ہیجان برپا ہو گیا تھا۔“

”ہیجان۔“ حمید نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مورتی کی وجہ سے۔“
”وہ مورتی لندن کے ماہر آثار قدیمہ جارج فنلے کی ملکیت تھی۔ اسے کسی نے چرا لیا اور عجیب و غریب وارداتوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔“

”بھلا یہ کیونکر معلوم ہوا کہ وہ وارداتیں اسی مورتی کی وجہ سے ہوئی تھیں۔“ حمید نے
”اس لئے کہ ایک بار وہ مورتی ایک قتل کے سلسلے میں پولیس کے قبضہ میں آ گئی تھی۔
کسی نے اسے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے پھراڑا لیا۔“

”واقعی عجیب بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اسکاٹ لینڈ یارڈ میں چوری کرنا آسان کام نہیں
”اس مورتی کے ماتھے پر بھی ایک سینگ ہے۔“ فریدی نے اخبار کی طرف اشارہ
ہوئے کہا۔ ”براؤن نے جس مورتی کے بارے میں بتایا تھا، اس کے ماتھے پر بھی ایک سینگ
”لیکن وہ ہے کیا بلا۔ اس کے لئے قتل کیوں ہوئے۔“ حمید نے کہا۔

”یہ ابھی تک نہیں معلوم ہوا۔“ فریدی نے کہا۔ ”جارج فنلے نے بھی اس کے متعلق
نہیں بتایا لیکن براؤن کا خیال ہے کہ اس نے دیدہ دانستہ اسکے راز کو چھپانے کی کوشش کی تھی
”اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں خواہ خواہ قیاس آرائی کرنے کا قائل نہیں۔“
”خیر ہوگا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔

فریدی اور حمید آج کل تین ماہ کی چھٹی پر تھے۔ انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ گرمیاں شروع
بسر کریں۔ قریباً سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ وہ شاید آج ہی شملہ کے لئے روانہ ہو
لیکن اس درزی کی علالت کی وجہ سے جوان کے کپڑے سی رہا تھا، انہیں دو ایک دن
توقف کرنا پڑا۔

”حمید.....!“ فریدی کہتے کہتے اچانک رک کر بولا۔
”جی.....!“

”ہم لوگ شملہ نہیں جائیں گے۔“

”کیوں.....؟“ حمید نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

”ہمیں آج ہی رات کی گاڑی سے رام گڑھ چلنا ہے۔“

”مخبر کیوں.....؟“

”ضروری کپڑے تو ہمارے پاس کافی سے زیادہ ہیں۔ ہم درزی کی صحت یابی کا انتظار نہ

کریں گے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اس کی وجہ۔“

”پیتل کی مورتی۔“

”لا حول ولاقوۃ۔“ حمید بولا۔ ”کیا آپ اسے تفتی کے جرم میں گرفتار کر لیں گے۔“

”حمید زیادہ بکواس اچھی نہیں ہوتی۔“

”میں ہرگز ہرگز رام گڑھ نہ جاؤں گا۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”تمہیں چلنا پڑے گا۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”قیامت تک نہیں جاؤں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”واہ یہ بھی اچھی رہی، بہتر وقت تو چھٹی ملی

ہے نہیں نہیں..... مجھ میں اب اتنی سکت نہیں رہ گئی کہ خواہ خواہ آپ کے ساتھ دوڑتا پھروں۔“

”کابل..... کام چور۔“

”مجھے قطعی چوٹ نہیں لگی۔“ حمید نے کہا۔ ”میں سو بار کابل..... ہزار بار کام چور پھر۔“

”تمہارا سر.....!“ فریدی نے کہا۔

”مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔“ حمید بولا۔

”دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں چلتے۔“ فریدی نے کہا۔

”میں آج رات کی گاڑی سے گھر چلا جاؤں گا۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”جہنم میں جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور لائبریری میں چلا گیا اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا

تھا کہ وہ کسی شدید الجھن میں مبتلا ہے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے میز پر کتابوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگا لیا۔

یہ کتابیں ایشیائی فن بت تراشی سے متعلق تھیں۔ تھوڑی دیر بعد حمید بھی تنہائی سے ان کتابوں کو دیکھ کر اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ فرید نے اسے گھور کر دیکھا۔

”آپ نے بھی اپنی زندگی برباد کر لی۔“ حمید نے کہا۔

”تم یہاں کیوں آئے۔“ فریدی نے کہا۔

اتنی دیر میں حمید اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”اوہ..... تو یہ اسی مورتی کے سلسلے میں چھان بین ہو رہی ہے۔“ حمید نے جھک کر فریدی کے سامنے کھلی ہوئی کتاب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ اچھل پڑا۔

”ارے یہ تو بالکل اسی تصویر سے مشابہ ہے..... بالکل وہی..... ہو ہو..... وی۔“

حیرت سے بولا۔

فریدی نے کتاب بند کر دی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ بالکل طرح جیسے کوئی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔

”ہمیں رام گڑھ چلنا ہی پڑے گا۔“ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی خواب میں بڑبڑاتا ہے۔

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ساتم نے میں کہہ رہا ہوں کہ رام گڑھ چلنا ضروری ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اگر“

جاؤ گے تو میں تنہا جاؤں گا۔“

”لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آپ کی اس بے تابی کی وجہ کیا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ایک بار یہ مورتی میرے والد مرحوم کے قبضے میں آ کر کھل

تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ حمید نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”والد صاحب کے بارے میں تو تمہیں پہلے ہی سے بہت کچھ معلوم ہے۔ وہ بھی میری

طرح کارناموں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ ایک بار یہ مورتی ان کے ہاتھ بھی لگی تھی لیکن

پراسرار طریقے سے غائب ہو گئی۔ یہ مجھے ابھی ابھی اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا۔ انہا

پہاڑوں کی ملکہ

کتاب میں جھپی ہوئی تصویر کے نیچے پیتل کی مورتی کے متعلق لکھا ہے۔“ فریدی نے کتاب کو بار بار گول کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو۔“

حمید فریدی کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھنے لگا۔

۲۸ جنوری ۱۸۹۳ء آج جب میں نے اس کتاب کا یہ صفحہ دیکھا تو مجھے دس سال قبل کا ایک

ذہ یاد آ گیا۔ اسی تصویر سے بالکل ملتی جلتی ایک چھوٹی سی پیتل کی مورتی مجھے ملی تھی لیکن وہ جس

بے انگیز طریقے سے مجھ تک پہنچی تھی اسی تحیر خیز طریقے پر غائب بھی ہو گئی۔ ایک رات گرمیوں

بارانے میں میں اپنے پائین باغ میں سو رہا تھا کہ دفعتاً کوئی میرے پٹنگ پر آ کر گرا۔ میری

فکری میں نے دیکھا ایک آدمی زخمی ہو کر مجھ پر پڑا زخمی طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اُسے ہٹانا

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے ہوش ہے۔ میں اُسے اٹھا کر اندر لے گیا وہ

ماگزیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ہوش آ گیا۔ وہ وہاں سے جانے کے لئے ضد کر رہا تھا۔ میں

اسے بہت پوچھا کہ وہ کون ہے اور کس طرح زخمی ہو گیا لیکن اس نے اس کے متعلق بتانے

کا انکار کر دیا۔ البتہ اس نے مجھے ایک پیتل کی مورتی نکال کر دی اور کہا کہ میں اسے اپنے پاس

ن رکھوں جسے وہ کسی موقع سے آ کر لے جائے گا۔ پھر اس واقعے کے تیسرے دن بعد اس

اٹل ایک نالے میں پڑی پائی گئی۔

وہ مورتی میرے پاس تقریباً ایک ہفتہ رہی پھر ایک دن غائب ہو گئی۔ میں نے اس معے کو

لے لے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔

حمید نے کتاب بند کر کے فریدی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”یہ سب قومی قوم کے سی جی لا کے دیوتا کی تصویر ہے، سبیلی قوم رام گڑھ سے ڈیڑھ سو میل

نہاں پکنار کے پہاڑی جنگلوں میں آباد ہے۔ سبیلی قوم کے لوگ اب سے کئی ہزار سال پیشتر

نہاں کے پوربی علاقے میں رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ کسی

نہاں کی بناء پر وہ لوگ تبت سے آ کر پکنار کے جنگلوں میں آباد ہو گئے۔ آج سے تین سو سال

ملاک انگریز سیاح نے انکشاف کیا تھا کہ اس قوم پر ایک انگریز عورت حکومت کرتی ہے۔ جسے

نہاں کی کچھ کر پوجتے ہیں اور اس سے بھی دلچسپ ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ یہ دیوی ان پر

تین سو سال سے حکومت کر رہی ہے۔

”کیا مطلب.....!“ حمید نے تحیر کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ بھلا وہ تین سو سال سے تک زندہ کیسے ہے؟“

”اس کے لئے انہوں نے ایک خوفناک طریقہ اختیار کیا ہے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا کہ اس ملکہ کے لئے وہ کسی گوری نسل کے نوجوان مرد کو پکڑ لاتے ہیں ملکہ کے ساتھ اس کی کردی جاتی ہے، اگر اس کے مرنے سے پہلے ملکہ مر گئی تو وہ اسے بھی قتل کر کے ملکہ کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں، ملکہ کی ایک لڑکی جو سب سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے اس کی جگہ ملکہ جاتی ہے اور اس کی بقیہ اولادیں دیوتا پر قربان کر دی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ اس ملکہ کی سفار کو برقرار رکھتے ہیں۔“

”واقعی بہت وحشیانہ طریقہ ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”آج کی مہذب دنیا اس وحشی قوم کا کس طرح برداشت کر رہی ہے؟“

”مجبوری ہے۔“ فریدی بولا۔ ”وہاں تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ انگریزوں نے ان کے ان مظلوموں کو بچانے کے لئے کافی جدوجہد کی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”لیکن یہ راز دنیا کو کس طرح معلوم ہوا۔“

”اسی سیاح کے ذریعے جس نے اس قوم کے حالات لکھے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”اسے وحشیوں نے پکڑ لیا تھا اور اس کی شادی ملکہ وقت کے ساتھ کر دی تھی لیکن اسے اپنے انجام کے متعلق معلوم ہوا تو وہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔“

حمید کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

”لیکن آخر رام گڑھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”اس مورتی کو دیکھنے کے لئے جس کے لئے عرصہ دراز سے لوگ جدوجہد کرتے آرہے ہیں۔“

”تو کیا آپ کو اس کی امید ہے کہ آپ اسے دیکھ سکیں گے۔“

”کیوں نہیں؟“

”جس چیز کے لئے وہ لوگ اپنی جانوں پر کھیلنے چلے آئے ہیں کیا اسے انہوں نے پولیس کے قبضے میں رہنے دیا ہوگا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ پولیس اس کے متعلق خاص علم نہ رکھتی ہو۔ اس نے اسے احتیاط سے بھی نہ رکھا ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ یقیناً پولیس کے قبضے سے نکل گئی ہوگی۔“

”پھر.....؟“ حمید نے فریدی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”لیکن میں اس مورتی کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں لوگوں کی دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی ہے؟“

”ارے چھوڑیے بھی ہوگا کچھ خزانے و زانے کا چکر، میں نے اس قسم کے بہتیرے ناول پڑھے ہیں۔ وہ مورتی یقیناً کسی زمین دوز خزانے کا حال بتاتی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن یہ تو سوچو..... اس میں لطف کتنا آئے گا۔“

”لطف کیا آئے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر آپ نے ان لوگوں کا سراغ لگا بھی لیا جو اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تو اس سے فائدہ! ظاہر ہے کہ وہ لوگ اس جدوجہد کا مقصد کسی لڑائی بھی ظاہر نہ ہونے دیں گے۔“

”خیر چھوڑو..... ان باتوں کو۔“ فریدی نے کہا۔ ”تین ماہ کی چھٹی میں نے محض تفریح کی نظر لی ہے اور رام گڑھ ایک بہترین تفریح گاہ بھی ہے۔“

”لیکن میں تو اسے تفریح گاہ ہرگز نہیں سمجھتا۔“

”بھئی تم مت چلنا میرے ساتھ۔“ فریدی نے اکتا کر کہا۔ ”خواہ مخواہ بکواس کرنے سے کیا فائدہ۔“

”تو کیا میں یہاں اکیلے رہ کر کھیاں ماروں گا۔“

”نہیں باقاعدہ ان کی پرورش کرنا۔“ فریدی نے کہا۔

”عجیب مصیبت میں جان ہے۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”مگر وہی فضول باتیں! ارے میاں اب کون سی مصیبت ہے۔“

”کیا یہ کم مصیبت ہے کہ میں اتنے دنوں تک آپ سے دور رہوں گا۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا اچھا بابا..... اب جاؤ بھی۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں دیکھنی ہیں۔“ فریدی نے کہا اور
پڑاؤوں کا ڈھیر اٹھنے پلٹنے لگا۔

مڈ بھڑ

”ارے تو میری کھوپڑی کیوں چاٹ رہے ہو بھائی۔“ فریدی نے عاجز آ کر اٹھے ہو۔
”کہا۔“ لو میں ہی چلا جاتا ہوں۔“

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رام گڑھ پہنچنے پر فریدی کو معلوم ہوا کہ وہ مورتی پولیس کے قبضے
سے بھی نکل گئی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ماتھر کو فریدی کے استفسار پر حیرت ضرور ہوئی۔ لیکن
پھر فریدی نے اسے مطمئن کر دیا کہ اس نے یونہی بلا مقصد اس مورتی کا تذکرہ کیا تھا۔ ماتھر نے
اُسے بتایا کہ وہ مورتی اسی کے پاس تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اسے عجائب خانے کے منتظم کے
حوالے کر دے گا لیکن وہ کہیں گم ہو گئی ہے اور ماتھر نے اسے کوئی زیادہ اہمیت بھی نہیں دی بلکہ
اسے تو ان ماہرین آثار قدیمہ پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے اس مورتی کے متعلق زمین و آسمان
کے فلاہے ملا کر رکھ دیئے تھے۔ ہوگی بھی چند رگبت کے زمانے کی۔ لیکن اس سے آج کی دنیا کو
کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

حمید کو ہنسنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ ہر وقت فریدی کو چھیڑتا رہتا۔ اٹھتے بیٹھتے پیتل کی مورتی
کا تذکرہ چھیڑ کر اس کے سراغ رسانی کے جنون کا مضحکہ اڑاتا..... آج بھی وہ صبح سے اسے بُری
طرح تنگ کر رہا تھا۔ اس وقت شام کو جب دونوں ٹہلنے کے لئے نکلے تو حمید نے اسے پھر چھیڑنا
شروع کر دیا۔

”ارے وہ کیا.....!“ حمید نے کہا۔

”کہاں.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وہ ادھر.....!“

”تو پھر چلو.....!“
”یہ مشکل ہے۔“
”تو جہنم میں جاؤ۔“

”لیکن وہاں بھی اکیلے دل نہ لگے گا۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔
”اچھانی الحال لائبریری سے نکل جاؤ۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔
”لیکن جاؤں کہاں؟“

”تو میں بھی چلتا ہوں آپ ہی کے ساتھ۔“
”بھی مجھے پریشان مت کیا کرو۔“ فریدی بے دلی سے بولا۔
”تو آپ کب چل رہے ہیں رام گڑھ۔“
”تم سے مطلب.....!“

”بغیر مطلب نہیں پوچھ رہا ہوں۔“
”میں تمہیں نہیں لے جاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔
”تو میں آپ کے کاندھے پر تو چڑھ کر جاؤں گا نہیں۔“
”نہیں بھئی..... تم اس بار میرا ساتھ نہ دے سکو گے۔“ فریدی نے تنک آ کر کہا۔
”کیوں.....؟“

”ہو سکتا ہے کہ یہ میرا آخری کارنامہ ہو۔“
”معلوم نہیں آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔
”مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“

”جب تو میں آپ کا ساتھ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔“
”اماں تم تو جان کو آ جاتے ہو۔“
”کچھ بھی ہو مجھے تو اب چلنا ہی پڑے گا۔“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”میں سمجھا شاید پیتل کی مورتی پڑی ہے۔“

”آخر تم میرا مسئلہ اڑانے پر کیوں اتر آئے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ نے کام ہی ایسا کیا ہے۔“

”بھئی تم عجیب آدمی ہو..... آخر تم میرے ساتھ آئے ہی کیوں؟“

”اس لئے کہ اب آپ کو یہاں سے واپس لے جاؤں۔“ حمید نے کہا۔

”قطعاً غلط.....!“ فریدی بولا۔ ”میں چھٹیاں یہیں گزاروں گا۔“

”وہ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”واقعی بزرگوں کے اقوال کا قائل ہونا ہی

پڑتا ہے۔“

”کیسے اقوال.....!“

”یہی کہ بیوی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ شاید اسے کوئی معقول جملہ نہیں سوچھ سکا تھا۔

”پوپی..... پوپی۔“ فریدی نے اپنے ننھے منھے کتے کو پکارا جو سڑک پار کر کے دوسری

طرف بھاگنے لگا تھا۔

”بھلا بتائیے ان پوپوں سوپوں کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید نے براہِ سامہ

بنا کر کہا۔

”اگر بیوی ہوتی تو ان کے بجائے اسے لے آتا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”میں کہتا ہوں آپ اپنی زندگی فضول بر باد کر رہے ہیں۔“

”بس آپ ہی کو خانہ آبادی مبارک رہے۔ خاکسار کو تلقین کی ضرورت نہیں۔“ فریدی بولا۔

”اچھا تو کب تک یونہی سڑکیں تپتے رہیں گے چلے سامنے والے پارک میں چل کر بیٹھیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ایک فلائنگ بھی نہیں چلے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اودھ اچھا تو یہ بات۔“

وہاں وہ نیلی نیلی ساریاں جولہا رہی ہیں۔ خیر جناب چلے۔“

یہ دونوں پارک میں آئے۔ پوپی اپنی ننھی ننھی منجھان بالوں والی دم لہراتا ہوا ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دفعتاً ایک لیسٹین کتا اس پر جھپٹا۔ قبل اس کے کہ فریدی آگے بڑھ کر اسے چڑاتا۔ لیسٹین کتے نے اسے دو تین پٹھنیاں دے دیں۔ ایک طرف سے ایک خوبصورت انگریز لڑکی چپتی ہوئی کتے کی طرف دوڑی اور پوپی کو اس سے چھین کر گود میں اٹھالیا جس پر بچ سے وہ لڑکی آئی تھی اس پر ایک انگریز مرد بھی بیٹھا تھا۔ فریدی جھلاہٹ میں اس کی طرف بڑھا۔

”کیوں جناب یہ کتا آپ کا ہے؟“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”کیوں.....!“ اس نے فریدی کو تنکھی نظروں سے گھور کر پوچھا۔

”وہ اس لئے کہ اس نے میرے کتے کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”اس قسم کے وحشی کتے آزاد رکھے جاتے ہیں۔“ فریدی نے تیز لہجے میں کہا۔

انگریز نے کوئی جواب دینے کے بجائے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”مسٹر مجھے افسوس ہے۔“ لڑکی نے فریدی کے قریب آ کر کہا۔ پھر اپنے ساتھی انگریز سے

طلب ہو کر بولی۔

”تمام تم بعض اوقات ضرورت سے زیادہ احمق ہو جاتے ہو۔“

”تو اب میں کیا کروں..... کتا ہی تو ہے۔“ انگریز بولا۔

”اگر یہی بات ہے تو ٹھہرو میں بھی ایک منگاتا ہوں۔“ فریدی نے تلخ لہجے میں کہا۔

”جاؤ جاؤ مت دماغ چاٹو۔“ انگریز گرج کر بولا۔

”اچھا تو اگر تم اپنے باپ کے بیٹے ہو تو اس وقت تک یہاں ٹھہرنا جب تک کہ میرا کتا بھی

مال نہ آجائے۔“

لڑکی اپنے ساتھی کو پھر برا بھلا کہنے لگی۔ لیکن شاید اس پر جھگڑا کرنے کا جنون سا طاری

لگایا تھا۔ اس نے فریدی کا چیلنج منظور کر لیا۔

”حمید.....!“ فریدی حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”لیو ڈنگو.....!“

حمید زخمی پوپی کو گود میں اٹھا کر پارک سے باہر نکل گیا۔ فریدی نے جو کتا منگوایا تھا وہ دنیا

کی خطرناک ترین افریقائی نسل سے تھا۔

بات کافی بڑھ گئی تھی۔ لڑکی کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بُری طرح گھبرائی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف اس کے ساتھی کی آنکھوں سے نفرت اور حقارت جھلک رہی تھی۔ ایک جوان العمر اور تندرست آدمی تھا۔ اس کے بھاری اور غیر متناسب جڑے اس کی طبیعت کا اظہار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد حمید ایک سرکش کتے کی زنجیر تھامے پارک میں داخل ہوا۔ لیسٹن کے پیروں کے پاس پڑا اونگھ رہا تھا۔ فریدی کے کتے یلو ڈگلو کی آمد پر دفعتاً چونک کر بیڑہ فریدی نے اپنے کتے کے پٹے سے زنجیر الگ کر لی۔ یلو ڈگلو کو دیکھ کر انگریز کے کتے نے شروع کیا۔ ڈگلو پہلے تو اسے خاموشی سے گھورتا رہا پھر یکایک اس پر جھپٹ پڑا۔ لڑکی چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ انگریز بھی ایک طرف ہٹ گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد لیسٹن نے ایک خوفناک ماری اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یلو ڈگلو نے اس کا گلا چھاڑ دیا تھا۔ زمین پر خون کی چادر سی پھیل گئی۔ انگریز نے اپنا پستول نکال لیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں فائر ہوا اور انگریز کا پستول اچھل دور جا گرا۔ فریدی کے ریوالور کی نالی سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر نکل کر فضا میں مل گئی تھی۔ فائر کی آوازیں کر بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔

فریدی نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ انگریز جیسے ہی پستول اٹھانے کی لئے جگا پولیس کانسٹیبل آ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ حمید نے یلو ڈگلو کے زنجیر ڈال دی اور فائر کا اشارہ پاتے ہی وہ پارک سے کتے سمیت روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے کتوں کی ضرورت دیکھ رہے تھے لیکن انہوں نے صرف انگریز کو پستول نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔ فریدی طرف وہ اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ اپنا ریوالور جیب میں رکھ چکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلد ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ انگریز کے گرد بھیر اکٹھی ہو رہی تھی اور فریدی سے جا چکا تھا۔

انگریز چند پڑھے لکھے آدمیوں کی مدد سے پولیس کو سارا واقعہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے باوجود بھی اسے قریب کے تھانے میں جانا ہی پڑا۔

ادھر حمید بوکھلایا ہوا اپنی قیام پر پہنچا۔ اسے رہ کر فریدی کی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیا حماقت کی۔ بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت۔ اگر وہ انگریز فریدی کی گولی سے زخمی ہو گیا ہوتا۔ وہ انہیں خیالات میں دیر تک الجھا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے گزر گئے لیکن فریدی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دوران میں اس نے کو توالی کے دو پتھر لگائے لیکن نہ معلوم ہوسکا کہ فریدی کہاں ہے۔ البتہ پارک کے حادثے کے متعلق کئی دلچسپ باتیں سننے میں آئیں۔ یہ سب ایک پراسرار آدمی کے متعلق تھیں، جس کے کتے نے ایک انتہائی توانا اور تندرست لیسٹن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کے نشانے کی تعریفوں کے بل باندھے جا رہے تھے کہ اس کی گولی انگریز کے پستول پر لگی اور وہ ہاتھ سے نکل گیا..... خیر حمید کو یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ انگریز زخمی نہیں ہوا، خود اسے تعجب ہونے لگا کہ اتنی جلدی میں فریدی اتنا کامیاب نشانہ کیسے لے سکا۔ لیکن اسے یہ سوچ کر الجھن ہو رہی تھی کہ پولیس اس معاملے کی تحقیقات ضرور کرے گی اور اگر یہ چیز ظاہر ہو گئی تو بڑی سبکی ہوگی۔ وہ فریدی کی نیک نامی پر ایک ہلکا سا دھبہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چہ جائیکہ اس پر قانون شکنی کا الزام عائد ہو وہ سوچ رہا تھا کہ اس انگریز اور اس کی ساتھی لڑکی نے ہم لوگوں کو اچھی طرح پہچان لیا ہوگا۔ اب اگر کہیں اور مڈ بھیر ہو گئی تو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فریدی کے آتے ہی وہ اسے واپس چلنے کا مشورہ دے گا۔ لیکن اسے اس کی ایک فیصد بھی توقع نہیں تھی کہ فریدی اس کے مشورے پر عمل کرے گا۔ وہ اس کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا جب تک کہ وہ کم بخت پیتل کی مورتی مل نہ جائے گی اور فریدی اس کے راز کو دریافت نہ کرے گا اس کا یہاں سے ہلنا ناممکن ہے۔

دس بج گئے تھے لیکن فریدی نہ لوٹا۔ رات حد درجہ تاریک تھی۔ آسمان میں غبار ہونے کی وجہ سے ستارے بھی مدھم پڑ گئے تھے۔ رام گڑھ کی حسین پہاڑیاں تاریکی کی چادر اوڑھے خاموش کھڑی تھیں۔ پہاڑی جھینگروں کی تیز آوازوں نے ماحول میں ایک عجیب قسم کی ویران یکسانیت پیدا کر رکھی تھی۔ کبھی کبھی بھٹکے ہوئے تیز کی صدا سنائے میں لہرا کر رہ جاتی۔ حمید برآمدے میں بیٹھا فریدی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ حمید کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں فریدی کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔

”واقعی تم میں ایک سعادت مند بیوی بننے کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔“
حمید کوئی جواب دیئے بغیر سیدھا ڈائینگ روم کی طرف چلا گیا۔ کھانے کی میز پر تھوڑی دیر
تاہوٹی رہی۔ پھر فریدی نے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔
”مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اور اتنے ڈرامائی انداز میں کامیابی ہوگی۔ اسے محض
اتفاق سمجھنا چاہئے کہ میں انہیں لوگوں سے الگ پڑا جن کی تلاش تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ حمید چونک کر بولا۔

”ہتیل کی صورتی۔“ فریدی جبکہ حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”لا حول ولا قوۃ.....!“ حمید نوالا پلیٹ میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی نے قہقہہ لگایا۔

”بھلا کھانے پر غصہ اتارنے سے کیا فائدہ؟“ فریدی نے کہا۔ ”بیٹھو بیٹھو۔“ حمید بیٹھ گیا۔

لیکن اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار نظر آرہے تھے۔

”بھئی تم سن کر اچھل پڑو گے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں سننا چاہتا جس سے مجھے خواہ مخواہ اچھلنا کودنا پڑے۔“

”وہ لڑکی تھی نا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”خیر چھوڑو ہٹاؤ.....!“

”اوہ.....! سے تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ حمید نے جلدی سے پوچھا۔

”کافی خوبصورت ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”واقعی ایسی لڑکیاں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔“ حمید بولا۔ ”غضب کی ہے۔“

”میں وہ انتظام کر رہا ہوں کہ تمہیں کچھ دن اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔“ فریدی سنجیدگی

سے بولا۔

حمید کی رال باقاعدہ طور پر ٹپکنے لگی۔

”کیا تم اس کے ساتھ رہنا پسند کرو گے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”شاید آپ کوئی بہت ہی خطرناک قسم کا مذاق کرنے والے ہیں۔“ حمید بولا۔

”نہیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

دفعتاً اسے کچھ دور اندھیرے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا
دوسرے لمحے میں فریدی اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”اور اب آپ اس طرح مسکرا رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔“ حمید نے جھلک کر کہا۔
”بگڑومت پیارے۔“ فریدی چپک کر بولا۔ ”مہینوں کی منزل گھنٹوں میں طے کر
آ رہا ہوں۔“

”خواہ مخواہ اتنی دیر پریشان کر ڈالا۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ اب شوہر پرست بیوی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر
گے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”بس بس رہنے دیجئے۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔ ”ابھی بتاؤں گا تو حواس گم ہو جائیں گے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا۔“ فریدی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ انگریز بڑی طرح زخمی ہو گیا ہے۔“

”بہت اچھے۔“ فریدی قہقہہ لگا کر بولا۔ ”شاید تم انہیوں کی محفل سے اٹھ کر آئے ہو۔“

”خیر مجھے کیا ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”جی مجھے سب کچھ معلوم ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں اتنا اناڑی نشانہ باز نہیں ہوں۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن آپ کو یہ کیا سوچھی تھی۔“

”بھئی کیا بتاؤں غصہ ہی تو ہے آ گیا۔“ فریدی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”پولیس نے اس کی رپورٹ درج کر لی ہے۔“

”کر لی ہوگی۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔

”دیکھئے جناب۔“ حمید نے کہا۔ ”ہر جگہ یہ لاٹ صاحبی کام نہیں آ سکتی۔ اگر ہم لوگ اس
معاملے میں پھنس گئے تو بڑی بے عزتی ہوگی۔“

”اچھا جی.....!“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”آج کل بڑے عاقبت اندیش ہو رہے ہو؟“

”خیر مارے گولی مجھے کیا۔“ حمید اٹھتے ہوئے منہ پھلا کر بولا۔ ”بھوک کے مارے برا حال

ہو گیا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔

”جانتے ہو وہ کون ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”بھلا میں کیا جانوں۔“

”جارج فنلے کی لڑکی جو لیا۔“

”جارج فنلے۔“ حمید چونک کر بولا۔ ”یہ نام کہیں سنا تو ہے۔“

”میری ہی زبانی سنا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”وہ کون ہے؟“

”لندن کا ایک ماہر آثار قدیمہ۔“

حمید کچھ سوچنے لگا۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر نفرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس

فریدی کو گھور کر دیکھا جو قاب سے شور پٹ نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔

”پھر وہی پیتل کی مورتی..... خدا اسے عارت کرے۔“ حمید جھلا کر بولا

”تو تمہیں جولیا پسند نہیں آئی۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”جہنم میں لگتی جو لیا۔“ حمید منہ سکوڑ کر بولا۔

”پھر تو میں ہی اس سے عشق کروں گا۔“

”آپ کی مرضی۔“

تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ فریدی کھانا کھا چکا تھا۔ حمید خیالات میں ڈو

آہستہ آہستہ منہ چلا رہا تھا۔ فریدی اٹھ کر ٹبلے لگا۔

”لیکن جارج فنلے یہاں کہاں؟“

”یہی چیز قابل غور ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”بہت ممکن ہے کہ اس نے بھی اخبارات میں مورتی کے متعلق پڑھا ہو۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں..... وہ اس واقعے کے پہلے سے یہاں موجود ہے۔“

”اوہ.....!“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یک بیک آپ کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی۔“

”محض اتفاق.....!“ فریدی نے کہا۔ ”آج کے واقعے کی رپورٹ انہوں نے تھانی

رج کرادی ہے۔ اسی رپورٹ کے ذریعے مجھے معلوم ہوا جارج فنلے اس کی لڑکی جولیا اور وہ سر
راٹر کیپٹن آر تھر یہاں تقریباً ایک ماہ سے مقیم ہیں۔“

”وجہ.....؟“

”سیاحت.....!“

”ہوں..... تو اب مجھے کچھ عقل آرہی ہے۔“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”خیر بہت اچھا ہوا۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن عقل کے ساتھ ہی ساتھ تھوڑی ہمت بھی

کار ہے۔“

”تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ پیتل کی مورتی انہیں لوگوں کے قبضے میں ہے۔“

”قطعاً.....!“

”اور آپ کا ارادہ ہے کہ آپ اُسے ان کے پاس سے اڑا دیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں..... مجھی بھلا اس سے کیا فائدہ۔“

”تو پھر آپ میرے لئے باہمت ہونے کی دعائیں کیوں مانگ رہے ہیں۔“

”اس کی بھی ایک وجہ ہے۔“

”کیا.....!“

”ایک لمبی داستان۔“

”یعنی.....!“

”جارج فنلے کی پارٹی عنقریب مشرق کی طرف سفر کرنے والی ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔

”اور یہ بھی جانتے ہو۔“ فریدی نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔ ”کچھ تار کا جنگل

ال کئی قوم آباد ہے مشرق ہی کی طرف ہے۔“

”اوہ.....!“ حمید غور سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”جارج فنلے کا ساتھی کیپٹن آر تھر ایک زمانے میں یہاں محکمہ جنگلات کا آفیسر تھا۔ غالباً وہ

ان فنلے کی رہنمائی کرے گا۔“

”مگر یہ جارج فنلے صاحب اس خطرناک مہم پر اپنی صاحبزادی کو کیوں لے جا رہے ہیں۔“
 ”محض اسی لئے کہ میاں حمید اسی بہانے اپنے دوست اور بھائی فریدی کا ساتھ دے سکیں۔“
 ”یعنی تو کیا آپ بھی اس پارٹی کے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ حمید جلدی سے بولا۔
 ”قطعاً.....!“

”بھلا اس سے فائدہ۔“

”دونوں اپنی اپنی لیاقت کے مطابق تفریح کر سکیں گے۔ میں اس سفر سے لطف اٹھاؤں اور تم اس لڑکی کی گہری نیلی آنکھوں میں گیتوں کے جزیرے تلاش کرنا۔“
 ”تو کیا واقعی آپ جان دینے پر تلے ہوئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔
 ”تمہیں یہ خیال کیسے پیدا ہوا.....؟“
 ”ظاہر ہے کہ آرتھر اور جولیا ہم لوگوں کو دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔“
 ”اوہ.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”تم اس کی فکر نہ کرو۔“

”میں نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس سفر کے لئے تیار نہیں۔“ حمید نے کہا۔
 ”میں نہایت صدق دل سے کہتا ہوں کہ تمہیں اس کے لئے مجبور نہیں کروں گا۔“ فریدی نے کہا اور سگارسلا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

”لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ اکیلے سفر کریں۔“

”پھر تم چاہتے کیا ہو۔“

”یہی کہ آپ اپنا ارادہ قطعی ترک کر دیجئے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“

”نپولین کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

فریدی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ وہ دفعتاً چونک پڑا۔ حمید کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے

آہستہ سے بولا۔ ”یہ غراہٹ کیسی تھی؟“

”ادبہ ہوگا کوئی کتاب۔ ممکن ہے اپنا ہی کتاب ہو۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں یہ اپنے کتے کی آواز نہیں۔“ فریدی نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد غراہٹ کی آواز پھر سنائی دی۔ فریدی کی نگاہیں باہر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ دفعتاً کچھ دور ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک بڑا سا کتا دکھائی دی۔ ٹارچ کسی آدمی کے ہاتھ میں تھی جس کی روشنی میں صرف اس کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ کتا زمین پر سونگھ کر غرا رہا تھا۔ فریدی نے کمرے کی روشنی گل کر دی۔

”یہ کیا کیا آپ نے۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”خاموش.....!“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
 تھوڑی دیر میں پوری عمارت تاریک ہو گئی۔ حمید اب تک کھڑکی کے قریب کھڑا حیرت سے اس کتے کو دیکھ رہا تھا۔ کتا اسی جگہ گویا جم کر رہ گیا۔ وہ بار بار زمین سونگھتا اور پھر سر اٹھا کر غرا نے لگتا۔ اس کے پاس کھڑا ہوا آدمی ادھر ادھر ٹارچ کی روشنی ڈال رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ زب و جوار کی عمارتیں بھی تاریک تھیں۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ فریدی نے مکان کی روشنی کیوں گل کر دی اور وہ کہاں چلا گیا۔

اس آدمی کی ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر کی عمارتوں پر ریختی ہوئی پھر کتے پر آ کر جم گئی۔ دفعتاً کسی طرف سے ایک فائر ہوا اور کتا اچھل کر دور جا گرا۔ شاید یہ کتے کی آخری ہچکیاں تھیں۔ اندھیرے میں کوئی دور تک دوڑتا چلا گیا۔ پھر ملی زمین پر قدموں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی بارہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد سکوت چھا گیا۔

فریدی کی عجیب حرکت

حمید کی الجھن لچک بے لچک بڑھتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ فائر کی آواز دور سے ہونے لگی تھی۔ کتے کے شور کی وجہ سے پاس کی کئی عمارتوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی۔ کچھ لوگ

”اب ختم بھی کیجئے یہ پہیلیاں.....!“ حمید اکتا کر بولا۔

”یہ سنا بھی آرہی کا تھا۔ بہت خطرناک قسم کا بلڈ ہاؤنڈ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے شکار کی بو پا جانے پر اسے پاتال میں بھی نہیں چھوڑتا۔ آرہی نے شاید اسے اسپین کی لاش سنگھار کر یلو ڈنگو کے راستے پر لگا دیا تھا۔ لہذا جہاں تک ڈنگو اپنے پیروں سے ہل کر آیا تھا اس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، لیکن یہاں آ کر وہ مجبور ہو گیا۔ کیونکہ تم ڈنگو کو یہاں لے کر آئے تھے۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا جس کی وجہ سے اس وقت بچ گئے، ورنہ دوسری صورت میں وہ سیدھا یہیں آتا اور نت نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔“

”تو یہ کہئے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید خدا نخواستہ۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

”بھلا میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”خیر..... خیر..... ختم کرو یہ باتیں..... اپنا ضروری سامان ٹھیک کر لو..... ہمیں اسی وقت برکان چھوڑنا ہے۔“

”جی.....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”کیا مطلب.....؟“

”کسی ہوٹل میں چل کر رہیں گے۔“

”آخر کیوں؟“

”بھئی عجیب گھامڑ آدی ہو۔“ فریدی بولا۔ ”اس علاقے میں اس کتے پر گولی چلانے کا طلب یہ ہے کہ وہ لوگ یہیں کہیں رہتے ہیں۔“

”عجب ہے کہ اس انگریز سے اس بُری طرح خائف ہو گئے۔“ حمید نے کہا۔

”تم غلط سمجھے ابات یہ نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آرہی سے خائف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

”بال بات کا ہے کہ اگر دوبارہ اس کا سامنا ہو گیا تو میں اپنی اکیسویں کو عملی جامہ نہ پہنا سکوں گا۔“

”آخر وہ اکیسویں معلوم تو ہوں۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”اطمینان سے بتاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ابھی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“

”بے باطل خواستہ اٹھ کر ضروریات کی چیزیں اکٹھی کیں اور ایک سوٹ کیس میں رکھیں۔“

باہر بھی نکل آئے تھے۔ حمید نے بھی غیر ارادی طور پر کمرے میں روشنی کر دی اور باہر نکل آیا۔ چار پانچ آدمی جن کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں کتے کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک کافی قوی اور خوفناک کتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ ایسی مضحکہ خیز قسم کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ حمید اگلے پاؤں واپس آنا پڑا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ بے تحاشہ ہنسنا نہ شروع کر دے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا خریدی ایک آرام کرسی پر دراز سگار کے پلکے کش لے رہا تھا۔ اس کی رائفل کرسی کے بازو سے ٹکی ہوئی تھی۔ حمید کو دیکھ کر مسکرایا۔

”آخر آپ نے یہ سب کیا اودھم مچا رکھی ہے۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”خیر یہ بعد میں بتاؤں گا..... تم یہ بتاؤ کہ ڈنگو کو گھر تک کس طرح لائے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”مطلب یہ کہ وہ اپنے پیروں سے چل کر یہاں تک پہنچا تھا یا کسی اور طرح۔“

”آخر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”تم میرے سوال کا جواب دو۔“ فریدی نے اکتا کر کہا۔

”کچھ دور تک مجھے اس کو گود میں لانا پڑا تھا۔“

”کیا اسی جگہ سے نہیں جہاں ہم نے ابھی اس کتے کو دیکھا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بہت ممکن ہے وہی جگہ ہی ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”وہاں پہنچ کر وہ کسی طرح آگے بڑھ

نہیں رہا تھا۔ مجبوراً مجھے اسے گود میں اٹھانا پڑا۔“

”اوہ..... تو یہی وجہ تھی۔“ فریدی بے ساختہ بولا۔

”آخر آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں۔“ حمید نے بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی تم جس کتے کی لاش دیکھ آئے ہو اسے میں نے ہی مارا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن کیوں.....!“ حمید بے تابی سے بولا۔ ”آخر آج کتوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں

”اگر میں اسے ٹھکانے نہ لگا دیتا تو اچھی خاصی مصیبت آ جاتی اور میری بنائی ہوئی آ

خاک میں مل جاتی۔“ فریدی نے بجھا ہوا سگار ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

فریدی بھی انتظام میں مشغول ہو گیا۔ اس نے نوکروں کو ضروری ہدایات دیں اور انہیں ایک کمرہ دے کر اس وقت تک رام گڑھ میں مقیم رہنے کے لئے کہا جب تک وہ واپس نہ آئے۔ ان نوکروں کو وہ اپنے ہمراہ لایا تھا اور یہ سب معتبر اور پرانے نوکر تھے۔

فریدی اور حمید نے ایک ایک سوٹ کیس اور ہولڈال اٹھائے اور گھر سے نکل کر باہر پہاڑ ہوئی تاریکی میں گم ہو گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک متوسط درجے کے صاف ستھرے ہوٹل میں بحیثیت مرا داخل ہو رہے تھے۔ انہیں رہائش کے کمرے مل گئے۔

”کہتے حضور والا آپ کو اطمینان میسر ہوا یا نہیں۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”ہاں آں.....!“ فریدی چار پائی پر لیٹ کر حمید کی طرف کروٹ لیتا ہوا بولا۔ ”کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“

”ان سب بوکھلاہٹوں کا مطلب.....!“

”تم اسے بوکھلاہٹ کہہ رہے ہو پیارے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”جی نہیں..... بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں آپ۔“ حمید طنزیہ انداز میں بولا

”خیر..... کارنامہ میں انجام دے رہا ہوں۔ اس میں تم میرے برابر کے شریک رہو گے

”میں تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔“ حمید بے زاری سے بولا۔

”اس بار تمہیں پاؤں دھونے کا بھی موقع مل جائے گا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں نے وہ اسکیم بنائی ہے کہ تم سن کر اچھل پڑو گے۔“ فریدی نے کہا۔

”ارشاد.....!“

”جارج فنلے سفر کے نئے ساتھی مہیا کر رہا ہے۔ آج بھی اس نے دس پہاڑیوں کی غذا

حاصل کی ہیں۔ تقریباً پچاس آدمی اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ جدھر جانے کا ارادہ رکھتا

ادھر کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہے..... اس لئے سفر پیدل یا خچروں پر کیا جائے گا۔“

”تو پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”ہم دونوں بھی پہاڑی مزدوروں کی حیثیت سے اس پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”بہت خوب اور ڈیڑھ سو میل پیدل چل کر آخر میں اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔“ حمید

نے کہا۔

”تم ہمیشہ ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ عادت اچھی نہیں..... تمہیں تو عورت ہونا چاہئے تھا۔“

”بہی تو میری بد نصیبی ہے۔“ حمید بولا۔ ”خیر آپ اپنا بیان جاری رکھئے۔“

”کل ہم دونوں پہاڑی مزدوروں کے بھیس میں جارج فنلے سے ملیں گے۔“

”لیکن اس سے فائدہ..... ہمارا پول جلد ہی کھل جائے گا۔ اس لئے کہ ہم پہاڑی زبان لے جاتے۔“ حمید نے کہا۔

”تم صرف اپنے متعلق کہہ سکتے ہو۔“ فریدی بولا۔ ”میں ادھر کی زبان بخوبی بول سکتا ہوں۔“

”لیکن میں کیا کروں گا۔“ حمید اکتا کر بولا۔

”تم گونگے بن جانا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تمہارے متعلق پہاڑیوں میں یہ مشہور کر دوں گا کہ تم گونگے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”بس معاف رکھئے خاکسار کو۔“ حمید نے کہا۔ ”میں زندگی بھر ایسا نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر کل تم گھر واپس چلے جاؤ۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”آپ اپنا پروگرام بتائیے۔“

”بس صرف اتنی سی بات کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ چلنا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”محض اس صورتی کاراز جاننے کے لئے۔“

”ہاں.....؟“

”لیکن یہ کوئی عقل مندی کی حرکت نہ ہوگی۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ تو وہی مثل ہوئی کہ شکاری

دیکھیں اور بے وقوف ساتھ پھریں۔“

نیرے دن یہ کارواں جو بچپن آدمیوں پر مشتمل تھا مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ہی خچر بھی تھے جن پر چھوٹے چھوٹے خیمے اور دوسرا سامان لدا ہوا تھا۔ فریدی اور حمید کے خچروں پر بہت تھوڑا سامان تھا اس لئے وہ کبھی کبھی بیٹھ بھی لیتے تھے۔ حمید کو فریدی پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کتنی آسانی سے پہاڑی مزدوروں کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی ہو۔ وہی چال ڈھال..... وہی وحشیانہ انداز گفتگو۔ وہی ہی جفاکشی۔ وہ ہمیشہ نہایت عمدہ اور آرام دہ جوتے استعمال کرتا تھا اس وقت ہی آسانی کے ساتھ پتھریلی زمین پر ننگے پیر چل رہا تھا جیسے اس نے کبھی جوتے پہنے ہی نہ دیے۔

حمید کا دم گھٹ رہا تھا کیونکہ اس کی قفنی کی طرح چلنے والی زبان روک دی گئی تھی۔ فریدی کی انکس کے مطابق وہ ایک گونگے کی حیثیت سے پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ فریدی جب اس سے ٹاروں میں بات کرتا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ جاتی اور فریدی اسے بُری طرح گھورنے لگتا۔

فریدی نے کچھ اتنا گھناؤنا بھیس بدلا تھا کہ بعض اوقات تو حمید کا جی ماش ہونے لگتا۔ وہ بکا ادھیڑ عمر کے پہاڑی مزدور کے بھیس میں تھا۔ اس کے منہ سے ہر وقت رال بہہ بہہ کر ٹھوڑی سے نکلتی رہتی تھی۔ جسے وہ نہایت لا پرواہی سے پھٹی ہوئی قمیض کی آستیموں سے پونچھ لیتا تھا۔

اس وقت وہ ایک خچر کی باگ ڈور تھامے ایک موٹے سے بانس کا ڈنڈا ٹیکتا لنگڑاتا ہوا ہموار راستے طے کر رہا تھا۔ قافلے کی رفتار آہستہ آہستہ ست ہوتی جا رہی تھی۔ قافلے کا راہبر کچن آرتھر ڈیرا ڈالنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔ غالباً وہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی خیمہ نصب کر دینا چاہتا تھا۔

شام کی سرد ہوتی ہوئی سرخی مائل دھوپ پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف ایک پراسرار ٹانپا بھایا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جو پتھریلی زمین پر خچروں کی ٹاپوں کی آواز کے باوجود بھی برقرار تھا۔ کبھی کبھی پہاڑی عقاب کی تیز آواز دور تک لہراتی چلی جاتی۔

آرتھر جولیا اور جارج فنلے اپنے اپنے خچروں سے اتر پڑے۔ کارواں رک گیا۔ ایک گھنٹہ بعد ویران چٹانوں کے درمیان کافی چہل پہل نظر آنے لگی۔ خیمہ نصب کر دیئے گئے۔ جا بجا

”فی الحال اسے بے وقوفی ہی سمجھ لیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں مکمل ارادہ کر چکا ہوں۔“
”اور اگر راستے میں آرتھر یا جولیا نے ہمیں پہچان لیا تو شامت ہی آ جائے گی۔“
”تم مطمئن رہو..... اس کی نوبت نہ آنے پائے گی۔“ فریدی نے کہا۔
”میں تو پانچ سال سے مطمئن بیٹھا ہوں۔“

”اماں تم عجیب آدمی ہو۔“ فریدی جھلا کر بولا۔ ”میں تمہیں مجبور کب کرتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔“

”تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں ساتھ نہ چلوں گا۔ لیکن چلنے کا جو طریقہ آپ اختیار کر والے ہیں وہ انتہائی تکلیف دہ ہوگا ہر قسم کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نہ تو ہمارے قاعدے کے کپڑے ہوں گے اور نہ جوتے۔“

”یاد رہے واقعی بڑے عیاش ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ذرا اس زندگی میں بھی تو آ کر کہہ یہ کتنی پر لطف ہے۔“

”خیر صاحب..... چھوڑیے۔“ حمید نے جھانی لیتے ہوئے کہا۔ اب نیند آرہی ہے۔
”شب بخیر۔“

روانگی

فریدی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حمید اور وہ جارج فنلے کے بار برداروں کی ٹولی شامل کر لئے گئے۔ فریدی نے دو خچر خرید لئے تھے اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید حمید کی ہمت نہ بڑا ڈیڑھ سو میل کا پیدل سفر آسان کام نہیں اور پھر ایسے لوگوں کے لئے جن کی زندگی ہمت مشقت سے دور گزری ہو۔

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں میرے بیٹے۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر آستین سے اپنی رال پونچھتا ہوا بولا۔

”نہیں تم بالکل سچ کہہ رہے ہو۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہم لوگوں سے زیادہ پیٹو ہو۔“

”دیکھو میرے بچے تم ابھی مجھے نہیں جانتے۔“ فریدی نے کہا۔ ”تمہیں شاید اپنے تن و نوش پر گھنڈ ہے۔ ذرا میرا پیٹہ ہی موڑ دو۔“ فریدی نے اپنا پیٹہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ آرتھر رازوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

نوجوان نے فریدی کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسانیں اور زور کرنے لگا۔ لیکن موڑنا تو ارکار فریدی کے ہاتھ میں جنبش تک نہ ہوئی۔

”بس کر میرے بچے۔“ فریدی نے تھوڑے دیر کے بعد کہا۔ ”مجھے تیری طاقت کا اعتراف ہے، لیکن یہ پیٹہ لوہے کا ہے۔“

نوجوان مزدور نے اپنا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

”واقعی تم کافی طاقت ور ہو۔“ آرتھر نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ”اچھا یہ لو اپنے چاول اور..... اب تو خوش ہو۔“

”خدا صاحب کا بھلا کرے۔“

”گوٹکا تمہارا لڑکا ہے۔“ آرتھر نے پوچھا۔

”میرا بھائی ہے صاحب۔“

”اس کا چاول اسے دیا جائے گا۔“

”ہاں صاحب۔“

آرتھر آگے بڑھ گیا۔

حمید لکڑیاں سلگا رہا تھا۔ آگ پھونکتے پھونکتے اس کے آنسو بہہ چلے تھے۔ آگ تھی کہ

بڑا کام ہی نہ لیتی تھی۔ فریدی مسکراتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

”کیوں میاں حمید، خیریت تو ہے۔“ فریدی اس کے پاس بیٹھ کر آہستہ سے بولا۔

آگ جلادی گئی۔ دھند کا تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مغربی افق میں شوخ رنگوں کے لہریں سیاہی کے غبار میں دب کر آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔

آرتھر مزدوروں کو رات کے کھانے کے لئے چاول اور خشک مچھلیاں بانٹتا پھر رہا تھا کہ کی جگہ رک کر مزدوروں کو کچھ ہدایات بھی دینے لگتا تھا۔ وہ پہاڑی زبان بخوبی بول سکتا تھا۔ اس نے شاید ادھر کی زبانیں اسی وقت سیکھی تھیں جب وہ پہاڑی جنگلات کا افسر تھا۔ اس کے برعکس جارج فٹلے اور جولیا مشرقی زبانوں سے بالکل ناواقف تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آرتھر کو اپنا راہبر بنایا تھا۔

آرتھر جب فریدی کو اتنے ہی چاول دینے لگا جتنے کہ اس نے دوسروں کو دیئے تھے تو فریدی اس سے الجھ پڑا۔

”بھلا صاحب اتنے میں میرا کیا ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا یہ کم ہے۔“ آرتھر تیز لہجے میں بولا۔

”بہت کم.....!“

”اتنے ہی میں نے سب کو دیئے ہیں۔“ آرتھر نے کہا۔

”صاحب میں ان سب سے زیادہ کام کر سکتا ہوں۔“ فریدی بولا۔

”کیا کام کر سکتے ہو۔“

”بڑی بڑی چٹانیں لڑھکا سکتا ہوں۔ جنگلی جانوروں سے لڑ سکتا ہوں۔ ہاتھیوں کے سونے

اکھاڑ سکتا ہوں۔ میں شیر کا بیٹا ہوں۔“ فریدی نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور پھر

دوسرے مزدوروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ان جوانوں میں سے مجھے کوئی نہیں اندسکتا

ان میں سے ہر ایک کو اپنے ایک ہاتھ پر اٹھا کر کم از کم ایک میل تک لے جا سکتا ہوں۔“

”اوہو بڑے بہادر ہو تم.....“

”جی صاحب۔“

فریدی کے قریب ہی ایک قوی ہیکل نوجوان پہاڑی مزدور کھڑا اس کی ڈیگیں بن رہا تھا۔

اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

”دیکھئے آپ خواہ مخواہ مجھے تاؤ نہ دلائیے۔“ حمید نے جواب دیا۔

”یارتہم بہت کمزور دل کے آدمی ہو۔“

”اب اس سفر میں میرا زندہ رہنا محال ہے۔“ حمید بولا۔

”کیوں.....؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ حمید نے بے بسی سے کہا ”کہاں ہماری زندگی اور کہاں یہ پتھر ملی چٹانیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے چائے نصیب نہ ہوئی تو میرا مر جانا یقینی ہے۔“

”سے سر پھٹا جا رہا ہے۔“

”گھبراتے کیوں ہو پیارے۔ بہت جلد تمہاری چائے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“ فرید

نے کہا۔ ”بہت جلد یہ لوگ مجھ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”بس بیٹھے ہوئی قلعے بنایا کیجئے۔“ حمید جل کر بولا۔

”سن رہے ہو..... بخدا جولیا کی آواز میں بڑی منہاس ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”ہوگی سالی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”تمہاری جمالیاتی حس کہاں مرگئی حمید؟“

”دیکھئے میں اس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”خیر خدا کا شکر ہے کہ میں نے زندگی میں ایک بار تمہارے منہ سے یہ جملہ سن لیا۔“

فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”خدا تمہاری قیمتی کی طرح چلنے والی زبان کی مغفرت کرے۔ آمین۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے فریدی کے اور اپنے چاول ایک بڑے سے تیلے

ڈال کر آگ پر چڑھا دیئے تھے۔

”یار اس طرح ہمت نہ ہارو، دیکھو بہت جلد ہم لوگ اس پارٹی میں کوئی نمایاں جگہ حاصل

کر لیں گے۔“

”اتنی نمایاں کہ شاید انہیں ہم کو اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے۔“

”پھر وہی عورتوں کی سی باتیں۔“

ابھی ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک قوی ہیکل مزدوران کے پاس آ کر

دیا۔

”نا ہے..... بڑے طاقتور ہو.....!“ وہ فریدی کی طرف دیکھ کر طنز یہ انداز میں بولا۔

”جا بھائی جا اپنا کام کر..... مجھے چاول ابالنے ہیں۔“ فریدی لاپرواہی سے بولا۔

”مجھ سے کشتی لڑو گے۔“ پہاڑی مزدور اکڑ کر بولا۔

”نہیں بھائی میں بہت کمزور ہوں، جا میرا دماغ نہ چاٹ۔“ فریدی نے کہا اور جلتی ہوئی

لڑیوں کو ہلانے جلانے لگا۔

”لے یار تو تو بڑا بولا نکلا۔“ پہاڑی ہنس کر بولا۔

”آخر تو چاہتا کیا ہے۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کشتی.....!“

”اچھا چل پہلے صاحب سے پوچھ لیں، لیکن پھر تجھے لڑنا ہی پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔

دونوں آرتھر کے خیمے کے سامنے آئے، خیمے میں جولیا، آرتھر اور جارج فٹلے بیٹھے ہوئے

پائے پی رہے تھے۔

”کیا ہے؟“ آرتھر فریدی کو خیمے کے سامنے کھڑا دیکھ کر بولا۔

”صاحب میں اجازت لینے آیا ہوں۔“

”کس بات کی۔“

”یہ مجھ سے کشتی لڑنا چاہتا ہے۔“ فریدی نے مزدور کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

آرتھر ہنسنے لگا پھر اس نے جارج فٹلے کو فریدی کی شیخوں کے متعلق بتانا شروع کیا۔

”لیکن بہت گندا آدمی ہے۔“ جولیا ہونٹ سکڑ کر بولی۔ ”دیکھو رال کس بُری طرح بہہ

رہا ہے۔ لیکن میں ان کی لڑائی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

آرتھر نے انہیں اجازت دے دی۔ جولیا اور جارج فٹلے بھی خیمے سے باہر نکل آئے۔

فریدی اور مزدور ایک دوسرے پر پل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد مزدور ہانپنے لگا۔

”دیکھ بیٹا۔“ فریدی نے کہا۔ ”تو ابھی تک مجھے نہیں اکھاڑ پایا ہے..... اب سنبھل میں

تجھے اکھاڑتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ فریدی نے زور کر کے اٹھایا اور اپنے سر سے بلند کر کے

بول۔ ”بول کدھر پھینکوں۔“ لیکن پھر آہستہ سے سامنے زمین پر کھڑا کر دیا۔

”جا بھاگ۔ جا۔۔۔۔۔ جا کر اپنے چاول ابال بڑے بوزھوں کے منہ نہیں لگا کر نہ شامش۔۔۔۔۔!“ فریدی نے کہا۔

دور کھڑے ہوئے مزدوروں نے ہنسا شروع کر دیا اور شکست خوردہ مزدور خود ہی کھینا ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ ”مان گیا بابا واقعی تو استاد ہے“ اور پھر وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا اپنی ٹولی میں جا ملا۔

”واقعی بہت طاقت ور ہے۔“ جارج فنٹلے نے آر تھر سے کہا۔

”مگر بہت گندا مجھے تو بہت گھن آتی ہے۔“ جولیا بولی اور فریدی دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

”صاحب بولتے ہیں تم بہت طاقت ور ہو۔“ آر تھر نے فریدی سے کہا۔ ”لیکن ہم

صاحب تم کو گندا کہتی ہیں۔ تمہارے منہ سے رال بہتی ہے۔“

”صاحب میرے منہ میں چھالے ہیں، جب وہ اچھے ہو جائیں گے تو رال خود بخود بند

ہو جائے گی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا ہم تمہیں چھالوں کی دوا دیں گے۔“ آر تھر نے کہا۔

”لیکن صاحب اب میری طاقت بہت گھٹ جائے گی اور شاید میرا بھائی تو مر ہی جائے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ آر تھر نے پوچھا۔

”ہم دونوں چائے کے عادی ہیں۔ بھلا ہمیں چائے یہاں کہاں سے ملے گی۔“ فریدی

نے کہا۔

”ہم تمہیں چائے دیں گے، جاؤ اپنا برتن لاؤ۔“ آر تھر نے کہا۔

”صاحب کا بہت بہت شکریہ۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ بھی نکولس صاحب کی طرح ٹیک

اور رحم دل آدمی ہیں۔“

”کون نکولس صاحب۔“ آر تھر نے پوچھا۔

”ارے آپ نے نکولس صاحب کا نام نہیں سنا۔“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے

کہا۔ ”میجر یو ایم نکولس افریقہ کے مشہور شکاری۔“

”تم نہیں کیا جانو۔۔۔۔۔!“ آر تھر نے متعجبانہ لہجے میں پوچھا۔

”ارے بھلا مجھ سے زیادہ انہیں کون جانے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں نے تین سال تک

ان کے ساتھ افریقہ کے کالے جنگلوں کی خاک چھانی ہے۔“

آر تھر ہنسنے لگا جارج فنٹلے نے اس سے ہنسی کی وجہ پوچھی۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ میجر نکولس کے

ساتھ افریقہ میں رہ چکا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ جارج فنٹلے نے کہا۔

”مجھے ذرا اب اس پر کچھ شبہ ہو چلا ہے۔“ آر تھر نے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔!“ جارج فنٹلے نے چونک کر پوچھا۔

”کہیں یہ بھی انہیں دیسیوں میں سے نہ ہو جنہوں نے موتی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ جارج فنٹلے نے کہا اور فریدی کو گھورنے لگا۔

”خیر میں اس کا امتحان کئے لیتا ہوں۔“ آر تھر نے کہا اور پھر فریدی کی طرف مڑ کر بولا۔

”نکولس کا مستقل قیام افریقہ میں کہاں تھا۔“

”مومبارہ میں۔“ فریدی نے جواب دیا۔

وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”افریقہ کی سب سے زیادہ خطرناک چیز کیا ہے؟“ آر تھر نے پوچھا۔

”زہریلی کھسی، سی سی فلائی، جس کے حملے کی خبر تک نہیں ہوتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”شاید

آپ کو مجھ پر کچھ شبہ ہوا ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے ہیں کہ میں اپنے آقاؤں کے لئے جان تک

کی بازی لگا دیتا ہوں۔ جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ مگر صاحب اب وہ قدر داں کہاں، نکولس صاحب

مجھے اپنے برابر بٹھاتے تھے۔“

”بھلا میں تم پر کس بات کا شبہ کر سکتا ہوں۔“ آر تھر نے اچانک پوچھا۔

”یہی کہ میں آپ کو اپنے جھوٹے کارناموں کے قصے سنا کر آپ کا اعتماد حاصل کرنا

باتا ہوں۔ محض اس لئے کہ کسی دن موقعہ پا کر آپ لوگوں کو لوٹ لوں۔“ فریدی نے کہا۔

”تم غلط سمجھے۔“ آر تھر ہنس کر بولا۔ ”میں صرف اتنا جانتا چاہتا تھا کہ تم واقعی کام کے آدمی

”خیر صاحب یہ تو وقت پر ہی معلوم ہو سکے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”تم اس سے پہلے بھی کبھی مشرق کی طرف سفر کر چکے ہو۔“ آرتھر نے پوچھا۔

”صرف ایک بار۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور وہ واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ ایک بار آپ کی طرح ایک صاحب نے رام گڑھ میں بہت سے مزدوروں کو اکٹھا کیا تھا اور وہ بھی اسی طرز آئے تھے، لیکن کچھ دور چلنے کے بعد وہ اچانک لوٹ پڑے تھے۔ ان کی کوئی چیز چوری ہو گئی تھی۔ اس کا انہیں اتنا دکھ ہوا کہ وہ آگے نہ جاسکے۔“

”کیا چیز چوری ہو گئی تھی۔“

”یہ انہوں نے نہیں بتایا۔“

”ہوں.....!“ آرتھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ کہاں جانا چاہتے تھے۔“

”دریائے تامتھی کے کنارے۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ دوسرے کنارے پر جانا چاہتے تھے

لیکن ارادہ تھا کہ وہ مزدوروں کو ادھر ہی سے رخصت کر دیں گے۔“

”اوہ.....!“

آرتھر جارج فٹلے کی طرف مڑا۔ اپنی اور فریدی کی گفتگو کے متعلق انگریزی میں بتانے لگا۔

”ان باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مورتی کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ جولیا بولی۔ ”اگر

ایسا ہوتا تو وہ اس کا تذکرہ ہی نہ کرتا۔“

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ آرتھر نے کہا۔ پھر وہ فریدی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر

پہاڑی زبان میں بولا۔ ”جاؤ جاؤ اپنا برتن لاؤ..... تم ہر وقت یہاں سے چائے لے سکتے ہو اور

رات کو سوتے وقت میرے پاس آنا میں تمہارے چھالوں میں دو الگادوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد حمید اور فریدی آگ کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”کیوں برخوردار.....!“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”کہو کیسی رہی۔“

”بہت اچھی۔“ حمید بے زاری سے بولا اور چاول کے تیلے کو آگ پر سے اتارنے لگا۔

”ابھی کیا ہے میں اس سے بھی زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش..... اور کہو تو جولیا۔“

نہاری شادی کرادوں۔“

”بس جناب کی عنایت کا شکریہ۔“ حمید نے کہا۔ ”اس وقت تو مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے

جیسے میرے باپ کی بھی کبھی شادی نہ ہوئی ہو۔“

حمید کی شامت

سورج طلوع ہوتے ہی پھر سفر شروع ہو گیا۔ خیمے اکھاڑ کر خجروں پر بار کر دیئے گئے۔ جن

مزدوروں کے پاس خچر تھے وہ ان پر سامان لادنے کے بعد خود بھی بیٹھ گئے۔ بقیہ لوگ اپنے

مردوں پر کچھ نہ کچھ اٹھائے ہوئے پیدل چل رہے تھے، جولیا اور جارج فٹلے خجروں پر سوار آگے

آگے چل رہے تھے۔

اس وقت قافلہ بلندی سے ایک پر فضا وادی میں اتر رہا تھا۔ خشک پہاڑوں کا سلسلہ ختم

ہو چکا تھا۔ چاروں طرف ہری بھری پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے وادی میں چھوٹی سی پہاڑی

نئی ننھے ننھے قطرے اچھالتی ہوئی تیز رفتاری سے بہہ رہی تھی۔ سناٹے میں پانی کی آواز ایسی

معلوم ہو رہی تھی جیسے خوفناک دھند لکوں میں ستار کی مدہم سی جھنکار..... حمید کی رومان پسند طبیعت

گنگناتنے کے لئے بے قرار ہو گئی۔ لیکن وہ تو گونگا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا۔ اس کا دل چاہا اپنے خچر کے

دونوں کان اکھاڑ ڈالے۔ فریدی دور تھا ورنہ وہ اسے ایک آدھ بار کھا جانے والی نظروں سے

نمودر گھورتا۔ اس کا خچر جولیا کے پیچھے تھا۔ جولیا کے سنہرے بالوں کے نیچے سرخ و سپید گردن جس

کے درمیان میں ایک لطیف سی سلوٹ تھی۔ حمید کے دل میں گدگدیاں پیدا کر رہی تھی۔ کاش وہ

بال مکا جولیا کافی خوب صورت تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں دو پہاڑیوں کے درمیان غلاء سے

اکھائی دینے والے آسمان کی طرح پرکشش اور روح کو ایک انجانی دنیا میں کھینچ لے جانے والی

ہا رہا تھا۔

قافلہ جیسے ہی گاؤں میں داخل ہوا جنگلی اپنے اپنے جھونپڑوں سے نکل آئے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے نیزے تھے ان کی ڈراؤنی شکلیں دیکھ کر جولیا کی چیخیں نکل گئیں۔
 ”کوئی ان سے بولے نہیں۔“ آرتھر نے پلٹ کر پہاڑی مزدوروں سے کہا۔
 ”کارواں رک گیا۔ ہر آدمی کے سر پر دو دو جنگلی مسلط تھے۔

آرتھر نے چیخ کر جنگلیوں سے کچھ کہا۔ ان میں ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے آرتھر کا بازو پکڑ کر اسے بقیہ لوگوں سے الگ کر لیا وہ دونوں ایک طرف چلے گئے۔

”گھبرا نے کی بات نہیں، میں ان کے سردار کے پاس جا رہا ہوں۔“
 آرتھر نے جارحانہ سے کہا۔ وہ جنگلی آرتھر کو ایک بڑے جھونپڑے کے باہر چھوڑ کر خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا جس نے بے شمار بھدے زیورات پہن رکھے تھے اور اس کا منڈا ہوا سر پہلے رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ آرتھر کو دیکھتے ہی وہ ہنس پڑا۔ آرتھر نے اس کے قریب پہنچ کر مکا تانا جسے وہ بوسہ دے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے مکا تانا اور آرتھر اسے بوسہ دے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پھر دونوں نے زمین پر دو زانو بیٹھ کر آہستہ آہستہ تین بار اپنے سر ایک دوسرے سے گرائے۔ غالباً یہ ان کا معائنہ تھا۔ وہ شخص جو آرتھر کو لایا تھا سردار کا اشارہ پا کر آرتھر کے سامنے اچھٹے کونے لگا۔ اس نے آرتھر کے گرد تین چکر لگائے اور اس کا داہنا ہاتھ چوم کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر سردار نے اس سے کچھ کہا اور وہ اٹھ کر اس طرف چلا گیا جدھر جارحانہ فلتے وغیرہ کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر بعد خچروں پر سے سامان اتارا جانے لگا۔ پرانی شناسائی کی بناء پر جنگلیوں کے سردار نے آرتھر کو وہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ جولیا بڑی طرح خائف تھی۔ اگر کسی جنگلی سے اس کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو وہ خوف سے لرزے لگتی تھی، ایک بار خیمے میں جانے کے بعد وہ پھر باہر نہیں نکلی۔ فریدی اور حمید ایک خیمے کی رسیاں تان رہے تھے۔ حمید پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

تھیں۔ آنکھوں اور چہروں میں دوسری دلاؤیز چیز اوپری ہونٹ کی ہلکی سنہری روئیدگی تھی اور جب اس میں پسینے کی ننھی ننھی بوندیں بھی شامل ہو جاتیں تو وہ اور زیادہ حسین دکھائی دینے لگتی۔ دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد جب وہ چائے کا پہلا گھونٹ لیتی تو اس کی آنکھوں میں نرسا جھلکنے لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جسم کی تھکن اس کے چہرے پر ایک غم آلود زہا بن کر پھیل گئی ہو۔ حمید غیر ارادی طور پر اس کے قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ سوچتا کاش وہ اس حالت میں رہنے پر مجبور نہ ہوتا۔ کاش وہ بول سکتا۔

کارواں وادی میں اتر آیا تھا، آگے بڑھنے سے پہلے ندی پار کرنی ضروری تھی۔
 ”ندی زیادہ گہری نہیں ہے۔“ آرتھر نے جارحانہ سے کہا۔ ”ہم لوگ آسانی سے گزر جائیں گے۔ میں اس علاقے میں کچھ دن رہ چکا ہوں۔“
 جارحانہ فلتے نے بھی اپنا خچر پانی میں اتار دیا۔

تھوڑی دیر بعد پورا قافلہ ندی پار کر گیا۔ سامنے دور تک ہرا بھرا میدان پھیلا ہوا تھا۔
 ”دوسری چڑھائی ذرا تکلیف دہ ہوگی۔“ آرتھر نے جارحانہ سے کہا۔
 ”کیوں.....؟“

”وہاں ہمیں خود ہی راستے بنانے پڑیں گے لیکن یہ وقت زیادہ دور تک قائم نہیں رہے گی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمیں اس کے لئے دو تین دن پہلے ہی اپنی پچھلی تھکن دور کرنی پڑے گی۔“
 ”ہوں.....!“ جارحانہ فلتے نے کہا اور سر گریٹ سلگانے لگا۔

”آگے ایک گاؤں ہے وہاں ہم دو تین دن ٹھہر جائیں گے لیکن ہم لوگوں کو کافی محتاط رہنا پڑے گا کیونکہ اب ہمیں ایسے لوگوں سے دوچار ہونا ہے جو قطعی وحشی ہیں۔“

”اگر انہوں نے ہمیں گاؤں میں داخل نہ ہونے دیا تو.....!“ جارحانہ فلتے نے کہا۔
 ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ جنگلیوں کا سردار مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے ایک حادثے میں اس کی جان بچائی تھی۔“ آرتھر نے کہا۔ ”یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ جنگلی احسان فراموش نہیں ہوتے۔“
 ”مجھے تو انہیں دیکھ کر خوف آئے گا۔“ جولیا اٹھلا کر بولی اور حمید ہزار جان سے قربان ہوتے ہوئے بچا کیونکہ اچانک اس کے خچر نے ٹھوکر کھائی اور وہ سنبھل نہ جاتا تو سر کے بل زمین

”کیوں حمید صاحب..... ان جنگلی عورتوں میں سے کوئی پسند آئی۔“ فریدی نے اہر سے کہا۔

”ارے یہ عورتیں ہیں۔ اگر یہ عورتیں ہیں تو میں لفظ عورت پر سو بار لعنت بھیجتا ہوں۔“
”لیکن گھبراؤ نہیں صاحب زادے..... بہت جلد ان میں سے کوئی ایک تمہارے لئے سوہان روبرج بننے والی ہے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ حمید چونک کر بولا۔
”تم اس قوم کی عجیب و غریب مہمان نوازی سے واقف نہیں ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”آز رات تمہیں کسی نہ کسی عورت کے ساتھ ناچنا پڑے گا۔“

”دیکھئے میں خود کشتی کر لوں گا۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔
”میرے خیال میں خود کشتی سے زیادہ آسان تو وہ ناچ رہے گا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔
”دیکھئے..... میں آپ سے.....!“

”چپ چپ۔ آرتھر آ رہا ہے۔“ فریدی نے کہا۔
آرتھر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
”کہو تم ان جنگلیوں سے خائف تو نہیں ہو۔“ آرتھر نے فریدی سے ہنس کر پوچھا۔

”بالکل نہیں..... بھلا ان میں خوف زدہ کرنے والی کیا بات ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔
”کیا تمہارا وہ انگریز شکاری ادھر ہی سے گزرا تھا.....؟“
”نہیں..... دوسری طرف سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمیں وہ پہاڑی ندی نہیں پار کرنا پڑی تھی۔“

”اس قبیلے کا سردار میرا دوست ہے۔“ آرتھر نے کہا۔
”لیکن گونا قوم قابل اعتبار نہیں ہے۔“ فریدی بولا۔
”تمہیں کیا معلوم.....!“ آرتھر چونک کر بولا۔ ”تم شاید ادھر کبھی آئے ہی نہیں۔“
”یہ میں نے اپنے باپ کی زبانی سنا تھا۔“ فریدی نے جواب دیا۔
”نہیں..... ایسا نہیں ہے۔“

پہاڑوں کی ملکہ
”بنادینا میرا کام تھا آگے آپ کو اختیار ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خصوصاً ایسی صورت میں کہ آپ کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے۔ آپ کا محتاط رہنا ضروری ہے۔“

”بکواس ہے۔“ آرتھر نے ناخوشگوار لہجہ میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔
فریدی پھر خیمہ درست کرنے میں مشغول ہو گیا۔

خیمے نصب ہو چکے تھے۔ جارج فنلے وغیرہ آرام کرنے لگے۔ مزدوروں نے کھانا پکاتا رہ کر دیا۔ جنگلیوں کے تنگ دھڑنگ بچے کھانے کے لالچ میں مزدوروں کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ آرتھر سردار کے جھوپڑے میں چلا گیا۔ کثیف اور میلی عورتیں پہاڑی مزدوروں کو گھور گھور دیکھ رہی تھیں۔ فریدی اور حمید ایک جگہ بیٹھے اپنے چاول اباں رہے تھے۔ فریدی آرتھر سے ذیل روئیاں مانگ لایا تھا جنہیں وہ ایک بڑے سے تسلے میں بھگوائے ہوئے تھا۔

حمید جنگلی عورتوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ ان میں کئی جوان تھیں جنہیں اپنے تصور میں نہلا دھلا کر جدید طرز کے کپڑے پہنا رہا تھا۔
”اس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں آپ۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔
”کیوں کیا ارادہ ہے۔“

”کچھ نہیں..... میں نے کہا اگر اسے قاعدے کے کپڑے پہنا دیئے جائیں تو کیسی لگے۔“ حمید نے کہا۔

”ذرا ہوش میں آئیے..... مزدور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ عورتوں کو دیکھ کر یہ نہ بھول جائیے آپ گونگے ہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔
حمید خاموش ہو گیا لیکن اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

دفعتاً عورتوں اور بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ حمید اور فریدی چونک پڑے۔ سامنے توئی الجشہ اور سیاہ فام عورت کھڑی بچوں کو منہ چڑا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی۔ وہ ایک خارش زدہ کتیا کو گود میں اٹھائے پاگلوں کی طرح اچھلنے کودنے لگی۔ بچوں نے اس پر ہنسنے شروع کر دیئے۔ بچوں کی مائیں جھوپڑوں سے نکل آئیں اور اپنے اپنے بچوں کو الگ سے لگیں۔ شاید یہ عورت پاگل تھی۔ بچوں کے جاتے ہی وہ زمین پر بیٹھ کر خارش زدہ کتے کو

افغانی کی کوشش کرنے لگا لیکن اس نے فریدی کے ہاتھ میں کی جگہ دانت سے کاٹ لیا۔ اپنے
بڑے اور نوکیلے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لیا۔ حمید بدستور چیخے جا رہا تھا۔ پہاڑی مزدور دور کھڑے
بہن رہے تھے۔ بدقت تمام فریدی نے اس عورت کو الگ ہٹایا اور حمید اٹھ کر بھاگا اب وہ حمید کو
چھوڑ کر فریدی کی طرف پلٹ پڑی تھی۔ شور سن کر دو تین جنگلی آگئے۔ انہوں نے اس عورت کو
بڑوں کی انیاں چھا کر وہاں سے بھاگ دیا۔

حمید ناک کی سیدھ میں بے تحاشہ دوڑا جا رہا تھا۔ فریدی بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔
وقت تمام وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

”میں سمجھا..... سمجھا..... شش..... شاید..... وہ ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

فریدی نے اسے زمین پر بٹھا دیا..... وہ بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔

”میں اب..... میں اب..... خودکشی کر لوں گا۔“ حمید نے فریدی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ناکامی کے بعد یہی ہوتا ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”گھبراؤ نہیں..... میں تمہیں کوئی

تہاری دوامنگوا دوں گا۔“

”دیکھئے بس..... میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گا۔“ حمید غصے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں

بے بسی کے آنسو چھلک آئے تھے۔ فریدی نے اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اسے تسلی

دلا رہا تھا۔ واپس لے آیا۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پہاڑی مزدوروں کے

ماننے اس کی کافی بے عزتی ہوئی تھی۔ اب وہ اس پر ہنسا کریں گے۔ وہ ان پر کسی قسم کا اظہار بھی

کر سکے گا۔ کیونکہ وہ گونگا تھا۔ لیکن فریدی کو اس کی عقلمندی پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے بے

ناشر چیخنے چلانے میں اپنا گونگا پن برقرار رکھا تھا۔

پیار کرنے لگی۔ حمید ہنس رہا تھا۔ وہ دونوں پہاڑی مزدوروں کی ٹولی سے کافی فاصلے پر بیٹھے ہوئے
تھے۔ فریدی یوں بھی حمید کے مصنوعی گونگے پن کی وجہ سے ان لوگوں سے دور ہی رہتا تھا اور ان
دوری کی دوسری وجہ یہ تھی کہ پہاڑی مزدور فریدی سے جلتے لگے تھے، کیونکہ اسے آقاؤں کی
طرف سے خاص مراعات حاصل تھیں۔

پاگل عورت حمید کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس نے کتے کو پیار کرتے ہوئے اٹھا

دور پھینک دیا۔ کتا جیس جیس کر کے بھاگا اور وہ عورت دانت نکال نکال کر اسے مکہ دکھانے لگی

حمید زور سے ہنس پڑا۔ عورت چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس نے بھی جوابی تہقیر لگا

پھر وہ وہاں سے اٹھ کر فریدی اور حمید کے پاس آ بیٹھی۔ حمید گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں حمید صاحب کیا یہ عورت نہیں ہے۔ تشریف رکھئے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا

عورت حمید کی طرف دیکھ کر ہنسے جارہی تھی اور اب اس نے کچھ بھونڈے قسم کے اشارے

کرنے شروع کر دیئے تھے۔

”یہ کیا مصیبت آ گئی۔“ حمید جھنجھٹا۔

”مصیبت کیوں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم پر ہزار جان بے عاشر ہوئے

ہے۔ چلو تمہاری یہ شکایت تو رفع ہو گئی کہ عورتیں تم پر بہت کم عاشق ہوتی ہیں۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے پاگل عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچھا شاید تم تنہائی چاہتے ہو۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے“ کہہ کر حمید نے فریدی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھئی میں تمہارے عشق میں خلل نہیں ہونا چاہتا۔“ فریدی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔

عورت نہ جانے کیا سمجھی..... پہلے تو وہ کھڑی کچھ دیر تک ان کی کھینچا تانی دیکھتی رہی

اچانک حمید پر ٹوٹ پڑی۔

”ارے ارے.....!“ حمید بے بسی سے بولا۔ وہ حمید کو زمین پر گرا کر دبوچ بیٹھی۔

بڑی طرح چیخ رہا تھا۔ ایک خوفزدہ پرندے کی طرح جسے کسی عقاب نے دبایا ہو۔ فریدی اسے

جانے والوں کا پیچھا کرے۔

انہوں نے رائفلس پستول اور کارتوس ایک جھونپڑے میں لے جا کر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک آدمی تھوڑا تھوڑا سامان لے کر چٹانوں کے پیچھے غائب ہونے لگا۔ فریدی چٹانوں میں چھپتا چھپاتا ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ چٹانوں کے منہ پر ایک بڑا سا پتھر رکھ کر بیٹھ گئے۔ شیر کی کھال میں ملبوس قوی پیکل جنگلی شاید انہیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس نے پھر کچھ کہا اور اس کے ساتھی وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے پھر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ فریدی چٹانوں کی اوٹ سے جھانک جھانک کر انہیں دیکھتا رہا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو فریدی اس غار کے نزدیک آیا اور پتھر ہٹا کر سارا اسلحہ ایک دوسرے غار میں منتقل کر دیا۔ یہ غار بادی انظر میں غار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کافی اونچی چٹانوں پر چڑھ کر دیکھنے سے تو البتہ اس کا وہاں نظر آ سکتا تھا لیکن ایسا کوئی کرنے ہی کیوں لگا۔

آرتھر سے استفسار حال پر فریدی کو معلوم ہوا کہ سردار نے مجبوراً ان کے اسلحہ جات لے لئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ ان کی روانگی کے وقت انہیں واپس کر دیئے جائیں گے۔ آرتھر نے سردار کی مجبوری کی ایک لمبی چوڑی داستان سنائی۔ وہ نو جوان جو شیر کی کھال پہنے ہوئے تھا ان سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتا تھا کہ کسی طرح قبیلے والوں کو سردار کے خلاف اکسا کر خود سردار بن جائے چنانچہ ان لوگوں کے پیچھے ہی اس نے قبیلے والوں میں سردار کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ سردار نے انہیں قتل کر دینے کے لئے سفید آدمیوں کو بلایا ہے۔ جب اس کی خبر سردار کو ہوئی تو اس نے لوگوں کو سمجھا شروع کر دیا کہ وہ لوگ یہاں مہمان کی حیثیت سے قیام کریں گے اور پھر شیر کی کھال والے نو جوان نے اسلحہ لے لینے کی تجویز پیش کی اور وعدہ کیا کہ ان کی روانگی کے وقت اسلحہ واپس کر دیا جائے گا۔ آرتھر نے بتایا کہ سردار اس نو جوان سے بہت خائف رہتا ہے۔ اس نے قبیلے کے زیادہ تر نو جوانوں کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے، وہ اس کی پشت پناہی میں من مانی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔ سردار نے ان سے قسم لے لی ہے کہ وہ اسلحہ واپس کر دیں گے۔

”مگر صاحب یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔“ فریدی نے کہا۔ ”خدا خیر کرے۔“

ناچ اور جنگ

فریدی کھانا کھا کر جارج فنلے کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ وہاں کئی جنگلی کھڑے تھے۔ ان میں جنگلیوں کا سردار بھی تھا۔ آرتھر اور جارج فنلے اپنے اسلحہ لا لا کر ان کے سامنے ڈھیر کر رہے تھے جنہیں ایک قوی پیکل جوان اکٹھا کر رہا تھا۔ اس نے شیر کی کھال پہن رکھی تھی اور ساتھیوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور تندرست معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سردار سے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں سردار نے سر ہلایا اور آرتھر اسے کچھ کہنے لگا۔ آرتھر نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔ دو تین جنگلی خیمے میں گھس گئے اور بقیہ پہاڑی مزدوروں کے سامان کی تلاشی لینے لگے۔ فریدی مگر تھا۔ وہ جنگلیوں کی زبان قطعی نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس نے آرتھر سے پوچھا۔

”تم بھی انہیں اپنا سامان دکھا دو۔“ آرتھر نے کہا۔ ”بقیہ باتیں اطمینان سے بتاؤں گا۔“

فریدی اپنی بڑی سی گھڑی اٹھا لیا جسے وہ راستہ بھر اپنی پیٹھ پر باندھ رہا تھا۔

اس میں کچھ پھٹے پرانے کپڑے تھے اور تمباکو کے پتوں کا ایک بڑا سا بنڈل۔ ایک جھونپی سی چلم اور دوسری کچھ چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔

تلاشی ختم ہونے کے بعد جنگلیوں نے سارا اسلحہ اٹھایا اور ایک طرف چلے گئے۔ جنگلی سردار آرتھر کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو جولیا آرتھر پر برسے لگی۔

”تم نے اس پر اعتبار کیوں کر لیا۔“ اس نے کہا۔

”اس لئے کہ ان لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ آرتھر نے کہا۔

”اگر عقل مندی کا یہی حال رہا تو پیچھے چلے۔“ جولیا بولی۔

”بھئی تم ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتیں۔“ آرتھر نے اکتا کر کہا۔

جارج فنلے بھی اپنی بیٹی کو سمجھانے لگا۔

فریدی نے وہاں ٹھہر کر معاملے کی نوعیت سمجھنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ اسلحہ لے

”فکرت کرو سردار ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔“ آرتھر نے جواب دیا۔

”اگر خود ہی بے چارہ دھوکا کھا گیا ہو تو کیا ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہوگا بھی جو کچھ دیکھا جائے گا۔“ آرتھر نے اکتا کر کہا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوا تھا جیسے وہ خود بھی مطمئن نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ اب چارہ ہی کیا تھا کہ خاموشی سے بیٹھا جائے۔ خصوصاً جولیا بہت زیادہ خائف تھی اس نے بات بات پر الزامات مانگ کر نہ سہا کر دیئے تھے۔ آرتھر ان بوچھاڑوں سے گھبرایا ہوا تھا۔

دن گذر گیا تاریکی پھیلنے ہی فریدی ان چٹانوں کے درمیان پہنچ گیا جہاں اس نے غار میں رائفلس اور دوسرے اسلحہ جات چھپا دیئے تھے۔ ادھر ایک بڑے میدان میں جنگلوں کا سردار مہمانوں کی ضیافت کا انتظام کر رہا تھا۔ بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں جن میں۔ یذی کا تیل بھرا رہا تھا۔ جس کی سزاغہ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ جا بجا الاؤ بل رہے تھے جن پر مسلم ہرن بھونے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آرتھر جولیا اور جارج فٹلے بھی اپنے مزدوروں سمیت وہاں پہنچ گئے۔ جولیا خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ اگر آرتھر ضد نہ کرتا تو شاید وہ کبھی اس جگہ نہ جاتی۔

سب وہاں پہنچ گئے تھے لیکن فریدی لاپتہ تھا۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر ڈھول پیٹے جانے لگے اور پھر قبیلے کی جوان لڑکیاں دائرہ بنا کر ڈھول کی آواز پر ناچنے لگیں۔ جنگلی چیخ چیخ کر گارہے تھے۔ سردار کے قریب ہی شیر کی کھال والا جوان بیٹھا اپنے بازوؤں کی مچھلیاں اکڑا اکڑا کر دیکھ رہا تھا۔ اکثر وہ جولیا کی طرف لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ جولیا نرئی طرح لرز رہی تھی۔ دفعتاً وہ جانے کے لئے ابھی۔ شیر کی کھال والے نے چیخ کر کچھ کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی کئی نو جوان ناچتی ہوئی لڑکیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے ان کو پکڑ کر اچھلتا شروع کر دیا۔ جولیا جانے کے لئے مزی ہی تھی کہ شیر کی کھال والے نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کر ناچنے والوں کی بھیڑ میں لے آیا۔ جولیا کی چیخیں نکل گئیں۔ آرتھر اور جارج فٹلے اسے چھڑانے کے لئے آگے بڑھے لیکن ان کے سینوں کے سامنے کئی جنگلی نیزے لے کر آ گئے۔

سردار چیخنے لگا۔ شاید وہ اس حرکت پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ شیر کی کھال والے

سردار پر اپنا نیزہ تان لیا۔..... دونوں میں بہت ہی تیز قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ادھر جارج فٹلے فریڈر اچھلا کہہ رہا تھا۔

دفعتاً فریدی بھیڑ کو چیرتا ہوا آرتھر کے قریب پہنچا۔ آرتھر نرئی طرح گھبرایا ہوا تھا۔

”کیوں صاحب کیا معاملہ ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تم ٹھیک کہتے تھے، ہمیں دھوکا دیا گیا۔ اس شیطان نے اسی لئے ہمارا اسلحہ لے لینے کی یک شروع کی تھی۔“

”اور سردار کیا کہتا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”وہ بیچارہ بے قصور ہے۔ اس وقت پورا قبیلہ اس شیطان کا طرف دار ہو گیا ہے۔“

”سردار انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ وہ جولیا کو چھوڑ دے لیکن وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔“

”وہ آخر کہتا کیا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم لوگ نیزوں اور لڑائی سے نہیں لڑ سکتے اس لئے وہ کہتا ہے کہ جولیا اسی وقت واپس ہو سکتی ہے جب وہ مار ڈالا۔ کاش ہمارے پاس رائفلس ہوتیں۔“

”تو کیا وہ ہم میں سے ایک سے لڑنا چاہتا ہے۔ یا سب کو لٹکا رہا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”یہ مجھے معلوم نہیں۔“

”سردار سے پوچھئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اگر وہ تنہا لڑ کر اس کا فیصلہ کرنا چاہتا ہو تو میں بول۔“

آرتھر سردار سے گفتگو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد فریدی کی طرف مڑ کر بولا۔

”وہ کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں جولیا نہیں واپس ہو سکتی چاہے کوئی اس سے تنہا جنگ سہا جائے مجموعی حیثیت سے۔“

”اچھا اس سے کہہ دیجئے کہ ہمارا ایک آدمی اس سے لڑے گا اور ہاں آپ اپنے خیمے میں بیٹھ۔ آپ کا سارا اسلحہ وہاں موجود ہے اگر ہماری لڑائی کے دوران میں کوئی دوسرا دخل دے تو

سردار بھی فائر کرنا شروع کر دیجئے گا۔“

فریدی کو گود میں اٹھائے سارے میدان میں دوڑتے پھر رہے تھے۔
اسی رات کو جولیا، آرتھر، جارج اور فریدی خیمے میں بیٹھے ہوئے آج کے واقعات پر تبصرہ کر رہے تھے۔

”واقعی تم بہت کام کے آدمی نکلتے۔“ آرتھر نے فریدی سے کہا۔ ”صاحب اور میم صاحب دونوں تم سے بہت خوش ہیں۔ بولو کیا انعام چاہتے ہو؟“
”گرم گرم چائے کا صرف ایک کپ کیونکہ میں سرشام سے محنت کر رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
”بس ایک کپ چائے۔“ آرتھر نے حیرت سے پوچھا۔

”بس اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں دیے آپ کا پی چاہے تو دو ایک سگار بھی دے دیجئے گا۔“
آرتھر نے جارج فنلے کو اپنی اور فریدی کی گفتگو کا ماحصل بتایا۔ جولیا اٹھ کر اسنو گرم کرنے لگی۔
”صاحب کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے تم جیسا بہادر اور شیر چشم آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“
آرتھر نے فریدی سے کہا۔

”صاحب کی مہربانی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں نکولس صاحب جیسے انگریزوں کے ساتھ رہ چکا ہوں۔“

”آج ہمیں اس کا یقین ہو گیا ہے۔“ آرتھر ہنس کر بولا۔

”اس جنگی کی موت کا قبیلے پر کیسا اثر پڑا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اس کے ساتھی بڑی طرح خوفزدہ ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اب سردار انہیں زندہ نہ چھوڑے گا۔ سردار اس کی موت پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ اس نے بھی تمہارے پھر تیلے پن کی کافی تعریف کی ہے۔“

”میرے خیال سے تو اب ہمیں کوچ کر دینا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ کے پہاڑی اس سفر سے کچھ بیزار سے نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھے بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ واپس نہ ہو جائیں۔“ آرتھر نے کہا۔

”دیکھتے کیا ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”رام گڑھ کے پہاڑوں کے متعلق ایک کہاوٹ شہور ہے کہ وہ ناک کی سیدھ میں دوڑنے والے جنگی سوار ہیں۔ معلوم نہیں کتنی دور تک دوڑنے

”ہمارا اسلحہ خیمے میں کیسے پہنچا؟“ آرتھر حیرت سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔
”میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔“ فریدی نے کہا۔ ”جلدی کیجئے۔۔۔۔۔ میں اس سے پتہ چلا۔“
آرتھر نے جلدی سے جارج فنلے کو سب کچھ بتا دیا اور پھر سردار کی طرف مخاطب ہوا۔
اس دوران میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ جسے شیر کی کھال والے نے اپنے کانڈھے پر ڈال لیا تھا۔
آرتھر سردار سے گفتگو کرنے کے بعد خیمے کی طرف چلا گیا۔ سردار نے ایک نیزہ اور ڈھال فریدی کے سامنے ڈال دی۔

شیر کی کھال والے نے جولیا کو کانڈھے سے اتار کر اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔
چند لمحوں کے بعد فریدی اور وہ ایک دوسرے کے سامنے نیزہ تانے کھڑے تھے اور جب بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ فریدی بھوکے شیر کی طرح اپنے مقابل کو گھور رہا تھا۔ دفعتاً جنگی نیزہ مارا، فریدی نے ڈھال سامنے کر دی اور پینترہ بدل کر جنگی پر حملہ آور ہوا لیکن اس نے ہرا پھرتی سے وار خالی کر دیا۔ نیزوں کی انیاں ڈھالوں سے ٹکرا کر اکر چھٹا کے پیدا کر رہی تھیں۔
پندرہ بیس منٹ گزر گئے، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ آرتھر واپس آ گیا۔ جولیا بھی ہوش میں آ گئی تھی جنگی کے حملوں کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نو جوان ساتھی چیخ چیخ کر شاید اسے مدد دلا رہے تھے۔ جنگیوں کا سردار بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے ٹرا کھال والے کی سستی بڑھتی جا رہی تھی سردار کے چہرے پر تازگی کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فریدی کی کامیابی کا متنی ہو۔ دفعتاً شیر کی کھال والے نے جھلا کر نیزہ فریدی کو دے مارا۔ فریدی پھرتی سے بیٹھ گیا اور نیزہ سنسانا ہوا اس پر سے نکل گیا۔ اچانک ایک چیخ سنائی دی نیزہ دوسری طرف کھڑے ہوئے ایک جنگی کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔
فریدی ابھی سنبھلتے ہی نہ پایا تھا کہ شیر کی کھال والا اچھل کر اس پر آ رہا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے بھی ایک چیخ نکلی اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ فریدی نے اپنا نیزہ اٹھالیا تھا۔
اپنے ہی زور ہی میں اٹھے ہوئے نیزے کا شکار ہو گیا۔ جنگی جوان کے ساتھیوں نے آگے بڑھ چاہا لیکن اس پر سردار خود نیزہ لے کر میدان میں کود پڑا۔ جنگی سہم کر پیچھے ہٹ گئے کیونکہ ان کا ساتھی مارا جا چکا تھا۔ جارج فنلے کے مزدوروں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا شروع کر دیا۔

کے بعد پلٹ پڑیں۔“

”تو کیا ان کے واپس لوٹ جانے کے امکانات ہیں۔“ آر تھر نے پوچھا۔

”میں نے کہا تا کہ ان کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ آر تھر کچھ سوچنے لگا۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ جولیا چائے لے آئی۔ آج وہ اس گندے پہاڑی کے لئے اپنے ہی برتن میں چائے لائی تھی۔

فریدی چائے پینے لگا۔

رات بھر جاگتا رہا کیونکہ وہ جنگلیوں کی طرف سے مطمئن نہیں تھا، اس نے پہاڑیوں میں پستول اور رائفلیں تقسیم کر دی تھیں وہ سب رات بھر باری باری سے پہرہ دیتے رہے۔

آپس میں جھگڑا

دوسرے دن صبح خیمے اکھاڑ دیئے گئے۔ اس وقت کارواں جنگلیوں کی دو روہ قطاروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نفرت تھی، غصہ تھا، حقارت تھی، اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس قافلے کے ایک خچر تک کو زندہ نہ چھوڑتے، جنگلیوں کا سردار قافلے کے آگے چل رہا تھا۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی قافلے کو اگلی چڑھائی تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

سر سبز وادی سورج کی سنہری کرنوں میں نہا کر نکھر آئی تھی۔ ہری بھری گھاس سے ایک عجیب قسم کی دلا ویز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ خجروں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ قافلہ میدان سے گزر کر پہاڑیوں پر چڑھ رہا تھا۔ ان پہاڑیوں سے جنگلوں کے کچھ کچھ آثار شروع ہو گئے تھے۔

تازہ دم پہاڑی مزدوروں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ ان کی تیز آواز چٹانوں سے ٹکرا کر

ایک عجیب طرح کی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ذہن کی لامحدود وسعتوں میں ہندو تگن یادیں رنگ رہی ہوں۔

حمید کی نگاہیں جولیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جواب ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح کبھی کبھی پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگتی تھی۔ حمید کے ذہن میں فریدی جاگ اٹھا وہ سوچنے لگا کہ کاش فریدی نے اپنا یہ کارنامہ اپنی صحیح شکل و صورت میں انجام دیا ہوتا۔

فریدی کا خچر سب سے پیچھے تھا۔ حسب دستور وہ اس وقت بھی اپنے خچر کی باگ تھامے رہا سا ڈنڈا نیٹا ہوا پیدل چل رہا تھا۔ اس کی گٹھڑی اس کی پیٹھ پر بندھی ہوئی تھی۔

حمید نے دفعتاً اپنے خچر کی رفتار میں کمی کر دی۔ آہستہ آہستہ وہ فریدی کے برابر آ گیا۔

”آپ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔“ حمید نے کہا۔

”میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”نہیں..... واقعی آپ.....!“

”بالکل احمق ہیں۔“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

”بھلا بتائیے آپ کے رات والے کارنامے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا حمید صاحب آپ بھی فرما دیجئے کہ میرے کس کارنامے سے مجھے فائدہ پہنچا ہے۔“

فریدی نے ہنس کر کہا۔

”کسی سے نہیں۔“

”تو پھر تم نے خصوصیت سے رات والے کارنامے کا حوالہ کیوں دیا۔“

”اونہہ مجھے کہنا کچھ تھا اور کہہ کچھ گیا۔“ حمید نے کہا۔

”تو فرمائیے نا.....!“

”مطلب یہ کہ اگر آپ نے اصلی صورت میں کارنامہ سرانجام دیا ہوتا تو۔“

”تو کیا ہوتا۔“

”مطلب یہ کہ.....!“

”کہو کہو..... رک کیوں گئے۔“ فریدی نے کہا۔

حید نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہ بتائیے کہ اس مورتی کے بارے میں کیا رہا۔“
 ”ابھی تک کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی..... یوں تو میرا بھی خیال ہے کہ یہ لوگ کسی
 زمانے کے چکر میں ہیں۔ آرتھر اور جارج کبھی کبھی اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جارج کے پاس
 کوئی نقشہ بھی ہے جو غالباً کچنار کے جنگل تک پہنچنے کے راستوں سے متعلق ہے۔“

”آخر ہمیں ابھی کتنا اور چلنا ہے۔“ حید نے پوچھا۔
 ”ابھی تو آدھا راستہ ہی طے ہوا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”دریائے نامتی پار کرنے کے بعد
 ہم کچنار کے جنگلوں میں داخل ہوں گے۔“

”تو دریائے نامتی.....!“ حید نے کہا اور پھر رک کر کچھ سوچتا ہوا بولا۔
 ”میں اسی ندی کو دریائے نامتی سمجھا تھا۔“
 ”ارے وہ تو کوئی گم نام سی پہاڑی ندی ہے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”دیکھئے ابھی اور کتنی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔“ حید نے کہا۔ ”اور کتنے جنگلیوں آدم

فروں سے شرف ملاقات حاصل ہوتا ہے۔“
 ”بس تو اب یہ دعا مانگو کہ کسی جنگلی عورت سے تمہاری ملاقات نہ ہو۔ ورنہ تمہاری مردانگی
 اور عشق بازی دھری رہ جائے گی۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”نہیں دیکھئے مذاق نہیں..... میں اس سفر سے تنگ آ گیا ہوں۔“
 ”تو واپس چلے جاؤ.....!“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تم اس لڑکی جولیا سے بھی گئے
 زلزلے ہو۔“

”آپ بھی لڑکیوں کی بات لے بیٹھے۔“ حید نے کہا۔ ”ارے وہ جنگلی اسے پکڑ ہی لے
 ہا تو کون سی مصیبت آ جاتی۔ شادی کرتا اور گھر میں ڈال لیتا، بھلا میں کس مصرف کا ہوں۔“
 فریدی ہنس کر بولا۔ ”کیوں اپنا دل چھوٹا کرتے ہو۔ تمہارا مصرف تو کوئی مجھ سے پوچھے۔“

”جی ہاں..... جہاں جا ہا اٹھا کر پھینک دیا۔ حید تو الوکا پنٹھا ہے۔“
 ”خیر یہ تمہاری لیاقت ہے کہ اپنے منہ میاں الو بن رہے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔
 حید خاموش ہو گیا۔ فریدی نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ کارواں دور نکل گیا تھا، پہاڑی

”بات یہ ہے کہ جولیا.....!“ حید جملہ پورا نہ کر سکا۔

”اوہ سمجھا.....!“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”جولیا مجھ پر عاشق ہو جاتی اور میں اٹھارویں صدی
 کے کسی ناول کے ہیرو کی طرح ایک بار اور اپنی جان پر کھیل جانے کی کوشش کرتا۔ بہر حال لیکن
 تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوتا۔“

”فائدہ..... ارے میں دیکھ کر خوش ہوتا۔“ حید چپک کر بولا۔
 ”ضرور..... لیکن کل تم نے مجھے خوش ہونے کا موقع کیوں نہ دیا تھا۔“ فریدی نے طنز
 انداز میں کہا۔

”جی..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“
 ”آخر تم بھاگے کیوں تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔
 ”اور نہیں تو کیا جان دیتا۔“ حید جل کر بولا۔
 ”تم نے اس کا دل توڑ دیا۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔

”میں دراصل آپ کے لئے میدان خالی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔“ حید نے ہنس کر کہا۔
 ”آپ کی اور اس کی جوڑی مناسب رہتی۔ ذرا اپنی شکل ملاحظہ فرمائیے، اور ہاں یہ آپ کی رلا
 پنکٹی کیوں بند ہو گئی۔“

”آرتھر نے چھالوں میں دو لگا دی ہے۔“ فریدی نے ہنس کر جواب دیا۔
 ”آخر آپ نے اتنا گندا بھیس بدلنے میں کیا اچھائی دیکھی تھی۔“
 ”کچھ نہیں..... محض تفریح..... کیا اس سلسلے میں یہ تجربہ کم قیمتی ہے کہ لوگ مجھ سے
 ہونے کے باوجود بھی میری قدر کر سکتے ہیں۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”بس انہی تجربات میں آپ اپنی زندگی کا بہترین حصہ گزار دیجئے گا۔ میں کہتا ہوں آ
 آپ کی اس افتادگی طبع کی کوئی انتہا بھی ہے۔“

”اس کی انتہا اس وقت ہوگی جب میرے اعضاء پر بڑھاپے کا حملہ ہوگا اور اسی وقت
 کے فوائد بھی معلوم ہوں گے۔ میں اپنی بقیہ زندگی.....!“

”خیر چھوڑیے۔ ہٹائیے..... اگر بات زیادہ بڑھی تو ابھی آپ فلسفہ بولنے لگیں گے

مزدور شاید گاتے گاتے تھک گئے تھے، فریدی تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔

”آخر آپ بیدل کیوں چل رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”بارہ بجے کے بعد میں خنجر پر بیٹھوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ سب لوگ اس وقت خنجر دار، بیٹھے بیٹھے اکٹا جائیں گے اور انہیں بھی اڑا پڑے گا لیکن پھر ان سے بیدل بھی نہ چلا جائے گا۔ میں دن کے بہترین حصے میں بیدل چل کر اپنی تھکن کا بوجھ خنجر پر ڈال دوں گا اور پھر جب شام کو اتروں گا تو بالکل تازہ دم ہوں گا۔“
حمید نے اپنے خنجر کو قمی رسید کی اور قافلے میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔ فریدی بدستور بیدل چل رہا تھا۔

آفتاب آہستہ آہستہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ دھوپ میں کافی حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ آرتھر جارج وغیرہ نے اپنے کوٹ اتار دیئے تھے۔ وہ نسب پسینے میں تر تھے، جولیا کے شفاف چہرے پر پسینے کی بوندیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کسی تالاب میں کھلے ہوئے کنول کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطر بکھر گئے ہوں۔ دو ایک ہلکی ہلکی لٹیں بھگ کر ماتھے پر چپک گئی تھیں۔ تھکاوٹ نے اس کے آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی رعنائی پیدا کر دی تھی۔ حمید اس کے قریب پہنچ کر جمالیاتی حر کی تسکین کرنے لگا۔ وہ دراصل اسی کے سہارے سفر کی تکالیف کو بھلا دینا چاہتا تھا۔

قافلہ دن بھر چلتا رہا۔ اس دوران میں فریدی نے ایک بار بھی قافلے سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ بدستور پیچھے چلتا رہا۔ کئی بار آرتھر نے ٹوکا بھی لیکن اس نے اس کی پرواہ نہ کی۔ دراصل وہ ان جنگلیوں کی طرف سے مطمئن نہ تھا جن کی آنکھوں میں اس نے نفرت اور انتقام کو چنگاریاں دیکھی تھیں۔

شام ہوتے ہی پھر ایک مناسب جگہ پر خیمے نصب کر دیئے گئے۔ جابجا آگ روشن ہو گئی۔ فریدی اپنا برتن لے کر چائے لینے کے لئے آرتھر وغیرہ کے خیمے کی طرف چل پڑا۔ خیمے کی پشت پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اندر جارج اور آرتھر میں بہت تیز قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔

”آخر تم مجھے مورتی کا راز کیوں نہیں بتاتے۔“ آرتھر بولا۔

”میں تمہاری بے صبری کی وجہ جانتا چاہتا ہوں۔“ جارج فٹلے نے کہا۔

”عجیب بات ہے تو پھر تم نے مجھے راز دار بنایا ہی کیوں تھا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔“

”اعتبار نہ ہوتا تو تمہیں اپنے ساتھ لاتا ہی کیوں۔“ جارج فٹلے نے کہا۔ ”میں تم سے وعدہ

کر چکا ہوں کہ تم آدھے کے حق دار ہو گے۔ پھر اس پریشانی اور بے صبری کی وجہ۔“

”مجھے تمہاری نیت پر شک ہے۔“ آرتھر بولا۔

”تمہیں ایسا نہ کہنا چاہئے۔“ جولیا بولی۔

”یہ کاروباری معاملہ ہے، میں اس میں کسی قسم کے تکلف یا اخلاق کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔“

”تم آخر کیا چاہتے ہو۔“ جارج گرم ہو کر بولا۔

”مورتی کا مکمل راز.....!“

”ناممکن ہے..... میں ابھی نہیں بتا سکتا۔“ جارج بولا۔

”آخر کیوں.....؟“

”میری مرضی.....!“

”تو اس کا مطلب ہے کہ میں یہیں سے واپس ہو جاؤں۔“ آرتھر نے کہا۔

”تمہاری مرضی۔“

”لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔“ آرتھر نے کہا۔

”پاپا..... آپ آخر بتا کیوں نہیں دیتے..... یہاں سچ راستے میں جھگڑا کرنے سے کیا

اندہ۔“ جولیا بولی۔

”تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔“ جارج نے تیز لہجے میں کہا۔ جولیا خاموش ہو گئی۔

”خیر دیکھا جائے گا.....!“ آرتھر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تم واقعی واپس چلے جاؤ گے۔“ جولیا نے خوف زدہ لہجہ میں کہا۔

”ہاں.....!“

”تب تو ہمیں بھی لوٹ جانا پڑے گا۔“ جولیا مایوسانہ انداز میں بولی۔

”نہیں ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔“ جارج کڑے لہجہ میں بولا۔ ”نقشہ میں اچھی طرح

سمجھ چکا ہوں..... اب مجھے راستہ پانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔“

اس پر آرثر طنزیہ انداز میں ہنس پڑا۔

”نقشے پر بھروسہ مت کرو جارج.....!“ آرثر اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ان راہوں میں اچھے اچھے بھٹک جاتے ہیں۔“

”پرواہ مت کرو.....!“ جارج لا پرواہی سے بولا۔

”میں کہتی ہوں، آخر جھگڑے سے کیا فائدہ۔“ جولیا گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولی۔

”یہ اپنے باپ ہی سے پوچھو۔“ آرثر نے شانے ہلا کر کہا۔

”پاپا.....!“ جولیا بولی۔

”تم آخر پریشان کیوں ہوتی ہو۔“ جارج بولا۔ ”آرثر کو شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں

اس کے بغیر آگے نہ بڑھ سکوں گا۔“

”آگے کیا تم آگے سے بھی بڑھ سکو گے..... مگر.....؟“

”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔“ جارج آرثر کی بات کاٹ کر بولا۔ ”اگر مجھ پر اعتماد کر سکتے

ہو تو کرو، ورنہ میں تمہاری واپسی کا انتظام کر سکتا ہوں۔“

”جی شکریہ..... مجھے کسی انتظام کی ضرورت نہیں۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔“ آرثر نے کہا

اور خیمے سے نکل گیا۔ فریدی آگے بڑھ گیا۔

”چائے.....؟“ آرثر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ”تمہیں اب یہاں سے چائے نہیں

ملے گی۔“

”کیوں صاحب۔“

”یہ دونوں بہت بد دماغ ہیں، انہوں نے کہہ دیا ہے کہ کوئی گندا پہاڑی ان کے خیمے کے

قریب نہ آنے پائے۔“ آرثر نے کہا۔

فریدی اس کی چال بازی پر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

”اچھا صاحب.....!“ اس نے مردہ آواز میں کہا۔

”لیکن میں تمہیں چائے کا سامان دوں گا۔“ آرثر نے کہا۔ ”چلو میرے خیمے میں، میں

پہاڑوں کا قدر داں ہوں۔“

آرثر اپنے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے فریدی کی طرف مڑا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

”نہیں صاحب۔“

”پھر تم کیوں چل پڑے تھے۔“ آرثر نے پوچھا۔ ”اگر ہم تمہیں کسی مصیبت میں پھنسا

دیں تو۔“

”مصیبت۔ کہ تو ہم کیڑے ہیں صاحب۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”ہمیں معقول اجرت ملنی

ہائے۔ پھر ہمیں آپ جہنم ہی میں کیوں نہ جھونک دیں۔“

”کبھی کچھ ہمارے جنگلوں کا نام سنا ہے۔“ آرثر نے پوچھا۔

”ہاں صاحب.....!“

”ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔“

”ارے.....!“ فریدی اچھل پڑا۔ پھر وہ حیرت آمیز نظروں سے آرثر کو گھورنے لگا۔

”شاید آپ اس علاقہ کے حالات سے واقف نہیں۔“ فریدی پھر بولا۔

”ہم سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ آرثر نے کہا۔

”پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

آرثر ہنسنے لگا۔

”آپ شاید مذاق سمجھ رہے ہیں۔“

”نہیں میں سب کچھ جانتا ہوں۔“ آرثر بولا۔

”پھر.....؟“ فریدی نے استغیابانہ انداز میں کہا۔

”تم خود سوچو۔“ آرثر نے ہنس کر کہا۔ ”وہ کون سی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کے لئے آدمی

نہاکی بازی لگا سکتا ہے۔“

”بھلا میں کیا جانوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آپ کی قوم کے لوگ تو محض نام کی خاطر برقی

غل پر جان دے دیتے ہیں۔“

آرتھر ہنسنے لگا۔

”یہاں یہ بات نہیں۔“ آرتھر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم لوگ ایک خزانہ کی تلاش میں نکلے ہیں۔“
 ”اوہ.....!“ فریدی نے اس طرح کہا جیسے اس کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔
 ”ہاں افریقہ میں بھی میں نے کئی انگریزوں کو دیکھا ہے، جو فرضی خزانوں کے چکر میں خاک چھانا کرتے تھے۔“

”لیکن کچنار کے جنگلوں میں حقیقتاً ایک بڑا خزانہ ہے۔“ آرتھر بولا۔

”ہوگا صاحب..... ہمیں اس سے کیا، ہمیں تو اپنی اجرت سے کام ہے۔ مگر معاملہ خطرناک، اگر مزدوروں کو معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں سے لوٹ جائیں گے۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ آپ ادھر محض سیر و شکار کے لئے آئے ہیں۔“
 ”لیکن میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔“ آرتھر نے کہا۔ ”ایسا کرنا انسانیت کا خون کرنا ہوگا۔“

”آپ جانتے، جو بات تھی میں نے بتادی۔“

”میرے ساتھی کی نیت خراب ہو گئی ہے۔“ آرتھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”شاید وہ تمہیں تمہاری پوری اجرت بھی نہ دے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے کہا۔

”اس کا ارادہ ہے کہ وہ تمہیں دریائے نامتی کے اسی پار چھوڑ دے، کھانے کا سامان کم ہوتا جا رہا ہے۔ فرض کرو اگر اس نے تمہیں معقول اجرت دے بھی دی تو کیا تم ان پہاڑیوں میں روپیہ چباؤ گے، وہ تمہیں اناج کا ایک دانہ بھی نہ دے گا۔“

”یہ تو بہت بُری بات ہے صاحب۔“ فریدی نے کہا۔

”میں بھی اس کی اس کمینی حرکت سے خوش نہیں ہوں۔“ آرتھر نے کہا۔ ”خیر میں اسے

ایسی سزا دوں گا کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا۔“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آرتھر کی چالوں پر غور کر رہا تھا۔

”دریائے نامتی پار کرتے ہی وہ مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ آرتھر بولا۔

”کیوں.....!“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔

”ہم کہ پورا خزانہ ہضم کر سکے۔“

”لیکن یہ آپ کو معلوم کیسے ہوا.....؟“

”باپ بیٹی میں اس کے متعلق مشورہ ہو رہا تھا۔“ آرتھر نے جواب دیا۔

”تب تو واقعی آپ کو ہوشیار رہنا چاہئے۔“ فریدی بولا۔

”سنو میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔“ آرتھر نے کہا۔

”کیا.....!“

”ہم لوگ کھانے پینے کا ضروری سامان لے کر رات ہی کو یہاں سے چل دیں۔“

”ان دونوں کو یہاں تنہا چھوڑ دیا جائے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”اور مزدور.....؟“

”انہیں میں ٹھیک کر لوں گا۔“ آرتھر نے کہا۔

”مگر صاحب۔“

”کچھ نہیں..... میں یہ طے کر چکا ہوں۔“ آرتھر بولا۔ ”بے ایمانوں کو بے ایمانی سے پہلے

بچھا دینا زیادہ اچھا ہے..... اگر تم میرے ساتھ چلو گے تو مالامال کر دوں گا۔“

فریدی کچھ دیر تک چپ رہا۔

”یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ میں اپنے سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ آئیے معاملہ کی بات کی طرف..... مجھے آپ کیا دیں گے۔“

”جو تم مانگو.....!“ آرتھر بولا۔

”خزانے کا چوتھائی.....!“ فریدی نے کہا۔

”منقول۔“

”بہت اچھا اور اگر آپ نے دھوکا دیا تو نتیجے کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔“

”تم مطمئن رہو..... میں ایماندار آدمی ہوں۔“ آرتھر نے کہا۔ ”اچھا اب میں جا کر

مزدوروں سے معاملہ طے کرتا ہوں۔“

آرتھر چلا گیا اور فریدی چائے کا سامان لے کر حمید کے پاس آیا۔ اس نے سارا واقعہ حمید سے بتادیا۔

”تو پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔“

”مجھے بوڑھے جارج سے ہمدردی ہے۔“

”اور اس کی لڑکی سے؟“ حمید نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”بکومت..... بہت جلد ہمیں کچھ کرنا ہے۔“ فریدی نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

”تو بتائیے تاکر کیا ہے؟“

”جیسے ہی تم یہ سمجھو کہ سب سو گئے ہیں اپنا ضروری سامان لے کر یہاں سے چل دینا، ابھی

میں تمہیں وہ جگہ بتا دوں گا جہاں تمہیں چھپنا ہے۔“

”اور آپ.....!“

”میں مناسب وقت پر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

وقت گذرتا گیا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ حمید اپنا اور فریدی کا سامان لے کر بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک غار تھا جس پر کئی چٹانیں سناہ کئے ہوئے تھیں۔ حمید سنا سنا بٹھا رہا۔ تقریباً دو تین گھنٹے کے بعد اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ قریب ہی سے قافلہ گزر رہا تھا۔ یہ سب بہت احتیاط سے جا رہے تھے۔ شاید انہوں نے اپنے جوتے اتار دیئے تھے اور انچروں کے سموں پر کپڑے لپیٹ دیئے تھے تاکہ آواز نہ پکڑے ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد سناٹا چھا گیا۔ حمید کی پلکیں بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ جلد ہی اس پر نیند نے غلبہ پالیا۔

اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب فریدی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ سورج نکل آیا تھا، بیگنی بیگنی سرخ شعاعیں چٹانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

”آرتھر سب مزدوروں کو ساتھ لے گیا۔“ فریدی نے کہا۔

”اور وہ دونوں.....!“ حمید نے جلدی سے کہا۔

”حیران حیران چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آؤ چل کر انہیں دلا سادیں۔“

جارج اور جولیا اپنے خیمے میں اس طرح اداس اور پریشان بیٹھے تھے جیسے اپنے کسی عزیز کو زنی کر کے آئے ہوں..... حمید اور فریدی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دونوں اچھل پڑے۔

”ہوشیار ہو جاؤ..... جولیا۔“ جارج بولا۔ ”مجھے اس میں بھی آرتھر کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔“

”مگر ہم کب ہی کیا سکتے ہیں۔“ جولیا نے کہا۔ ”اس کمینے نے تو ہمارے پاس ایک پستول بھی

نہیں رہنے دیا۔“

فریدی اور حمید خیمے میں داخل ہو چکے تھے۔ جارج کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کے حملے کا خطرہ ہو۔ فریدی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جارج

لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ فریدی نے جیب سے

پیش کی مورتی اور راستے کا نقشہ نکال کر جارج کی طرف بڑھا دیا۔ باپ اور بیٹی حیرت زدہ

نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جارج نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی پکڑ لی۔

”جولیا..... یہ واقعی سچا بہادر ہے۔“ جارج بے اختیار بولا۔ ”کاش یہ ہماری زبان سمجھ سکتا۔“

تھوڑی دیر بعد فریدی جارج کو ان چٹانوں کے درمیان لے گیا جہاں اس نے کھانے پینے

کا کثیر سامان اور کچھ اسلحہ چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے یہ کام اسی وقت شروع کر دیا تھا جب آرتھر

اسے سمجھا بچھا کر دوسرے مزدوروں کو درغلانے چلا گیا تھا اور اس کے بعد سے وہ سائے کی طرح

آرتھر کے پیچھے لگا رہا تھا۔ جب آرتھر مورتی اور راستے کا نقشہ چرانے کے لئے جارج کے خیمے

میں گھسا تھا اس وقت بھی فریدی تھوڑے ہی فاصلے پر چھپا ہوا تھا اور اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

آرتھر نے مورتی چرائی اور اپنے خیمے میں لے آیا اور اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر پھر

مزدوروں کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی نے وہ مورتی اور نقشہ اس کے سوٹ کیس سے اڑا دیا..... اس نے

بارن کو سارے واقعات اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔

اور پھر اس ویرانے میں ان کے درمیان سے رنگ و نسل کی دیوار ہٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد

نیلے اپنے کپوں میں چائے پیش کر رہی تھی۔

کرتا ہوا گھڑا اب تک اس کی پیٹھ پر بندھا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ خورد و نوش کا سامان بھی ختم ہو گیا۔ لیکن انہیں اس کی پرواہ نہ تھی کیونکہ وہ اب جس خطے سے گزر رہے تھے وہاں بکثرت آبی پرندے اور جنگلی پھل ملتے تھے۔ جولیا بہت غدا حال ہو گئی تھی اس کے سرخ سپید چہرے پر ہلکی سی نیلا ہٹ دوڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی زندگی سے ناامید ہو جاتی اور جارج اسے ہمت دلانے لگتا۔ اس نے اسے شروع ہی سے اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن سیر و تفریح کے لالچ میں جولیا نے اس کا کہنا نہ مانا۔ وہ دراصل رائیڈر، میگروڈ کے ناولوں اور کارناموں سے بھرپور فلموں کی ماری ہوئی تھی اور خزانے سے زیادہ رومان کی تلاش میں آئی تھی۔

آرتھر کے جانے کے ٹھیک بیسویں دن بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ستیل ندی دریائے ہانتی سے مل گئی تھی۔ اب انہوں نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں اسے وہ پہاڑی مزدور دکھائی دیئے جو آرتھر کے ساتھ چپکے سے چلے آئے تھے۔ فریدی نے جارج وغیرہ کو چپ جانے کا اشارہ کیا اور خود اونچی نیچی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ تقریباً سو فٹ کی گہرائی میں ایک ننھی سی وادی تھی جس میں انہوں نے خیمے گاڑ دیئے تھے۔ فریدی چٹانوں کی آڑ لے کر نیچے اترنے لگا۔

بہر حال اس کی چھان بین کا خلاصہ یہ ہے کہ آرتھر ان پہاڑیوں میں نہیں تھا۔ فریدی وہیں چھپا بیٹھا رہا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ تاریکی کی چادر حد نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں پر پھیلی جا رہی تھی۔ دفعتاً ایک مزدور اس کی طرف آ نکلا جہاں فریدی چھپا ہوا تھا۔ وہ اچانک اس پر ٹوٹ پڑا۔ فریدی دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آرتھر کہاں ہے وہ مزدوروں کو لے کر دریا کے پار گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔

اندھیرے کی وجہ سے وہ مزدور فریدی کو پہچان نہ سکا۔ فریدی نے اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چلا جائے ورنہ کسی نہ کسی حادثہ کا شکار ہو جانے کے امکانات ہیں۔ مزدور کو چھوڑ کر فریدی جارج وغیرہ کے پاس واپس آ گیا اور پھر ان لوگوں نے تاریکی میں دریا کے کنارے کنارے چلنا شروع کیا۔ فریدی سوچ رہا تھا کہ وہ جارج کو آرتھر کی کشدگی کا حال کس

فریدی نے اشاروں ہی اشاروں میں جارج کو سمجھایا کہ اس حادثے سے دل شکستہ ہو کر اسے پیچھے نہ لوٹ جانا چاہئے اس نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ آخر وقت تک اس کا ساتھ دے رہے گا۔ اس پر جارج نے جولیا سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آرتھر نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ ”ہو سکتا ہے.....!“ جولیا بولی۔ ”لیکن یہ آرتھر سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔“ ”کاش یہ ہماری زبان سمجھ سکتا۔“ جارج ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

قریب تھا کہ حمید کچھ بول پڑے..... فریدی نے اسے گھور کر دیکھا۔

پہاڑوں کی ملکہ

سفر جاری رہا۔ فریدی کو راستے میں آرتھر سے ٹڈ بھڑ ہو جانے کی توقع تھی۔ اس نے اسے راستے ہی بدل دیا تھا۔ وہ سیدھا جانے کی بجائے پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا اور دریا میں چھوٹے چھوٹے گاؤں سے گزرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ دراصل دریائے ہانتی کی ایک چھوٹی سی شاخ ستیل ندی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ تقریباً پینتالیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ لوگ ستیل ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے انہوں نے کنارے ہی کنارے مغرب طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر انہیں بعض اوقات بہت ہی دشوار گزار راستوں سے گزرنے پڑا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہی ہوتا کہ جولیا تھک کر بیٹھ جاتی۔ فریدی کو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھانا پڑتا۔ حمید دیکھتا اور دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ ان راستوں کے لئے خنجر قطعی بے ثابیت ہوئے تھے۔ لہٰذا انہیں راستے ہی میں چھوڑ دینا پڑا۔ خنجر کے ساتھ ہی بہت سامان جس میں خیمے بھی شامل تھے ایک غار میں ڈال دیا گیا۔ خورد و نوش کا تھوڑا بہت سامان راتھلیں وغیرہ وہ لوگ اپنے کاندھوں پر لا کر چل رہے تھے۔ سب کچھ چھوڑ دیا گیا۔ لیکن فریدی

سورج سر پر آگیا تھا۔ وہ چلتے رہے۔ جولیا کی حالت غیر تھی۔ وہ قدم قدم پر لڑکھڑاتی جاتی تھی۔ آخر فریدی نے اسے پیٹھ پر لا دیا۔ وہ اپنا ڈائیک کر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ تقریباً دو بجے ایک بستی میں پہنچے۔ یہاں بے شمار جھوپڑے تھے۔ لیکن یہ بستی میں ایک خاص سلیقے کو دخل تھا۔ یہاں کے رہنے والے اگر مہذب نہیں تو نیم مہذب در تھے۔ عورتیں رنگین اور خوشنما لباسوں میں ملبوس نظر آتی تھیں اور مردوں کا لباس قریب بیک ہی تھا جو فریدی وغیرہ کو گرفتار کرنے والوں کے پیشرو کا تھا۔ بستی کے اندر صاف ستھری گلیں تھیں یہ لوگ جدھر سے گزرتے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی لیکن اس حالت میں بھی ان کی بے کسی قسم کے وحشیانہ پن کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ خاموشی اور حیرت سے اپنی سرزمین داخل ہونے والے اجنبیوں کو دیکھتے اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگتے۔ ان لوگوں کے رنگ گندمی تھا اور چہروں کی بناوٹ قریب قریب ویسی ہی تھی جیسے تبت کے باشندوں کے ہے کی ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی اداسی تھی، جو شاید انسانیت اور وحشیانہ کی آمیزش کا نتیجہ تھی۔

متعدد راستوں سے گزرتے ہوئے یہ لوگ ایک بڑے سے احاطے میں داخل ہوئے جس کا دیواریں مٹی کی تھیں لیکن انہیں بھی مختلف رنگوں کی گل کاریوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یہاں بل طرف بہت بڑے بڑے بت نصب تھے جو تعداد میں اٹھارہ تھے۔ دفعتاً فریدی چونک پڑا اور اُن حالت جارج فٹلے کی بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک بت بالکل اسی پیتل کی مورتی سے مشابہ تھا۔ ”سی جی لا.....!“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور جارج فٹلے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

احاطے کی دیوار کے نیچے تین طرف مسلح آدمی کھڑے تھے۔ یہ لوگ بھی وحشی معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی گردنوں میں کھوپڑی کی ہڈیوں کی مالائیں لٹکا رکھی تھیں۔ سامنے ایک بت بڑا سا بان تھا جس کے نیچے ایک کافی بلند چوڑے پر چھوٹے چھوٹے کرسی نما تخت پڑے ہوئے تھے۔

ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی ہتھیار بند وحشیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ ان میں

طرح بتائے، اب خود اسے اپنے گونگے پن سے الجھن ہونے لگتی تھی۔

بہر حال ایک جگہ رک کر فریدی نے دریا کی طرف اشارہ کیا کہ اب ہمیں پار چلنا چاہیے۔ جارج نے ایک تہہ کی ہوئی ربڑ کی کشتی نکالی اور اس میں سائیکل کے پمپ سے ہوا بھرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پانی میں تیرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ اتنی بڑی تھی کہ اس پر دس آدمی نہایت آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

کشتی میں بیٹھے وقت حمید کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ راستے بھر فریدی سے کپتار کے جنگل میں بسنے والی قوم کی زندگی کے واقعات سنتا آیا تھا۔ فریدی نے بتوار ہاتھ میں لئے کشتی کھینے لگا۔ رات حد درجہ تاریک تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر میں بارش ہو جائے گی۔ فریدی جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا۔

ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ دریا کا پانی دو میل سے کم طرح کم نہ رہا ہوگا۔ کنارے پر پہنچ کر جارج نے کشتی کی ہوائ نکالی۔ پھر اسے تہہ کر کے کاغذ، ڈال لیا۔

رات گزارنے کے لئے انہوں نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو چاروں طرف چٹانوں سے گھری ہوئی تھی اور ان چٹانوں پر کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ فریدی نے پروگرام بنایا تھا۔ سب باری باری سوتے جاگتے رہیں گے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ دن بھر کے تھکے ماندے جب کہ تو کوئی بھی اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو نہ روک سکا۔

اور پھر جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو ان کے سینوں پر جنگلیوں کے نیزوں کی انیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جولیا تو بے ہوش ہو گئی۔ یہ سب انتہائی کریہہ المنظر تھے اور انہوں نے اپنی گردنوں کی انسانی کھوپڑیوں کی مالائیں لٹکا رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک دراز قد آدمی تھا۔ جو ان کے مقابلے میں کچھ مہذب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ریشمی کپڑے کی ایک رنگین قبا پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ پن بھی نہیں تھا، جو اس کے دوسرے مسلح ساتھیوں کی آنکھوں میں تھا۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر فریدی کو تبت کے بدھ فقیر یاد آ گئے۔ اس نے فریدی وغیرہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سب ایک طرف چل پڑے۔ جنگلیوں نے انہیں حلقے میں لے لیا۔ گویا وہ قیدی تھے۔

مری مخاطب ہو کر پہاڑی زبان میں بولا۔

”اور تم دعا باز تم سے تو اچھی طرح سمجھوں گا۔“

”لیکن بزدلوں کی طرح نہیں۔ میں تمہیں بہادر سمجھتا ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”جارج..... میں یہاں کی ملکہ کا شوہر ہوں۔ کل ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔“ آرتھر نے

ہنس کر کہا۔

”اور کل ہی تم اس کے ساتھ دفن کر دیے جاؤ گے۔“ جارج طنزیہ انداز میں بولا۔

”اور کل کا حال کون جانے، ممکن ہے کل میں قدرتی موت مر جاؤں۔“ آرتھر ہنس کر بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت میری بیوی ہے۔ یہ جنگلی پھول جس میں خوشبو بھی ہے اور رنگ بھی۔“

”کیا یہ انگریزی بول سکتی ہے۔“ جولیا نے بے ساختہ پوچھا۔

”نہیں..... لیکن اتنی لاطینی جانتی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہ آسانی سمجھ سکتے

ہیں۔ یہ زبان شاید شروع سے یہاں کی ملکانیں ایک دوسری کو سکھاتی آئی ہیں۔“ آرتھر نے کہا۔

فریدی کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ لاطینی زبان جانتی ہے۔ فریدی نے سوچا کہ اب

بولتا ہی چاہئے ورنہ مفت میں جان جائے گی۔ لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں وہ اچھا خاصا

دخل رکھتا تھا۔

”اے دنیا کی طاقت ور ترین ملکہ۔“ فریدی نے قدرے جھک کر سیدھے کھڑے ہوتے

ہوئے لاطینی زبان میں کہا۔ ”کیا مہمانوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جاتا ہے؟“

آرتھر، جولیا اور جارج فٹلے بیک وقت چونک پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اے سیاہ فام اجنبی۔“ ملکہ بولی۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ ہمارا شوہر بہارِ شاہ کا بیٹا ہم

سے تمہیں پہلے ہی مانگ چکا ہے۔“

”خیر اگر سی۔ جی لادیو تاکا بیٹی چاہتی ہے کہ ہم اس پر قربان ہو جائیں تو ہمیں کوئی افسوس

نہیں۔ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

قل اس کے کہ ملکہ کچھ کہتی آرتھر چیخ پڑا۔

سے ایک آگے بڑھا اور سکھ پھونکنے لگا جس کی آواز سے جولیا ایک بار پھر چکرا گئی۔ اگر فریدی اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر گئی ہوتی۔

ان لوگوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ شور بدستور جاری رہا۔ دفعتاً سائبان کے نیچے

دو آدمی ہرے رنگ کے لبادے پہنے ہوئے نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہا اور مجمع

سنانا چھا گیا۔ فریدی وغیرہ کے گرفتار کرنے والوں کا پیشرو آگے بڑھا اور اس نے ان دونوں

کچھ کہا وہ دونوں چوہرے سے اتر کر ان کے پاس آئے اور فریدی کو گھورتا شروع کیا۔ وہ پل

چھپکائے بغیر انہیں گھور رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھیں پتھر کی ہوں۔

پھر ان دونوں نے جارج فٹلے کی رائفلوں اور پستولوں پر قبضہ کر لیا اور اس وقت تک

لوگوں کی جامہ تلاشی لیتے رہے جب تک کہ ایک ایک کارٹوس دستیاب نہیں ہو گیا۔ فریدی

گٹھری بھی ٹٹولی گئی لیکن اس میں تمباکو کے بندل اور ایک چھوٹی سی چلم کے علاوہ اور تھا ہی کیا۔

بندوقیں وغیرہ چھن جانے پر جولیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جارج اسے دلاسا دینے

کوشش کرنے لگا۔ لیکن خود اس کی حالت غیر ہو رہی تھی اور حمید کے چہرے پر تو زلزلہ سا

تھا۔ کبھی اس کے ناک کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے کبھی ہونٹ کانپنے لگتے۔ اس وقت اس نے فریاد

کو قہر آلود ننگا ہوں سے نہیں دیکھ۔ اگر کی آنکھوں میں اس وقت ایک عجیب قسم کی بے بسی تھی۔

دفعتاً بہت سی گھنٹیاں بجنے لگیں اور تریبان پھونکی جانے لگیں۔ دیوار کے قریب کھڑ

ہوئے مسلح وحشی سجدے میں گر گئے۔ سائبان کے پیچھے ایک جلوس دکھائی دے رہا تھا۔ رنگ بر

کی قبائیل لہرا رہی تھیں۔ سب سے پہلے ایک مرد اور ایک عورت سائبان کے نیچے آئے۔

آرتھر تھا جس نے اپنے قومی لباس کے بجائے ایک چمکیلا لبادہ پہن رکھا تھا جس میں جا بجا

رنگ اور قیمتی پتھر لٹکے ہوئے تھے۔ عورت غالباً یہاں کی سفید فام ملکہ تھی۔ یہ ایک خوبصورت

جوان العر عورت تھی۔ اس کے سر پر سیاہ رنگ کی لکڑی کا ایک تاج تھا جس کی چوٹی پر ایک بڑا

ہیرا نصب تھا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ کے لوگ جو شاید درباری تھے ان کے پیچھے

ہوئی چوکیوں پر بیٹھ گئے۔

”اوہ جارج فٹلے۔“ آرتھر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“ پھر وہ فریدی

”ارے میری حسین ترین ملکہ..... یہ مکار ہے..... غدار ہے..... ان کی باتوں میں نہ آؤ۔“
 ”میں تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ پورا کروں گی۔“ ملکہ نے مسکرا کر کہا۔ پھر اس نے سر
 وحشیوں سے کچھ کہا اور آرتھر سے لاطینی زبان میں بولی۔
 ”یہ ہمارے دیوتا میمون اعظم کی بھیبت ہیں۔“
 آرتھر نے قہقہہ لگایا۔

”لو سنو سر جارج..... تم ان لوگوں کے دیوتا بن مانس کی نذر کئے جاؤ گے۔ تم نے ا
 خوفناک گوریلا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ وہ دریا کے ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہتا ہے۔
 افسوس ہے کہ اب میں یہاں کے خزانے کا تہا مالک ہوں۔“

جارج نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اتنے بے درد نہ بنو۔“ جولیا بولی۔

”تمہارے باپ نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار کر کے خزانے کا راز
 دیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔“

جولیا لاکھ لاکھ روٹی اور گڑ گڑائی لیکن آرتھر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ملکہ نے سپاہیوں کو اشارہ کیا
 ان لوگوں کی ایک بار پھر تلاشی لی گئی۔

دریا میں ایک بڑی سی کشتی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانے پینے کے سامان کے علاوہ
 سے سب کچھ چھین لیا گیا۔ فالتو چیزوں میں فریدی کی تمباکو کا بندل بھی بیچ گیا تھا۔

”اف میرے خدا۔“ جارج کشتی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب..... سچ مجھے ہماری موت
 آگئی ہے۔“

”آپ آخر اتنا مایوس کیوں ہو گئے ہیں۔“ جولیا بولی۔

”سرہنری نے اپنے سفر نامے میں اس گوریلے کے متعلق بھی لکھا ہے۔“ جارج بولا۔

”وہ انتہائی خوفناک اور خونخوار ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس سے ا
 حفاظت کر سکیں گے۔“

ناؤ چل پڑی..... آگے چل کر دریائے نامتی ایک جگہ دو شاخوں میں بٹ گیا اور دریا

یہ زمین کا ایک حصہ ایک جزیرے کی شکل میں ابھر آیا تھا۔ اس کا طول و عرض تقریباً دو میل رہا ہوگا۔
 وہ چاروں اس جزیرے میں چھوڑ دیئے گئے۔ کشتی واپس جا چکی تھی۔ یہاں چاروں طرف
 نئے جنگل تھے۔ فریدی نے سب کو دریا کے اونچے کنارے سے نشیب میں اتار دیا۔ پھر وہ سب
 بجگہ بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے لگے۔

فریدی نے اپنی پیٹھ پر بندھا ہوا تمباکو کا گٹھڑا اتارا۔ دو تین پتے تل کر چلم میں رکھے اور
 باکو جلا کر اطمینان سے کش لینے لگا۔

گوریلا

اس شخص کا اطمینان دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔“ جارج نے جولیا سے کہا۔

”ہاں..... لیکن..... کیا یہ اس دردے کا مقابلہ کر سکے گا۔“ جولیا نے کہا۔

”ارادہ تو یہی ہے مس جولیا۔“ فریدی مسکرا کر انگریزی میں بولا۔

جارج اور جولیا دونوں اچھل پڑے۔

”اوہ تم انگریزی بول سکتے ہو۔“ جارج حیرت ہو کر بولا۔ ”تو پھر تم اتنے دنوں تک گونگے
 کیوں بنے رہے۔“

”مصلحت.....!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہاں تک پہنچ بھی نہیں
 لے سکتا تھا۔“

”تو گویا تم شروع ہی سے ہمارے مقصد سے واقف تھے۔“ جولیا نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”لیکن تم کون ہو.....؟“ جارج نے پوچھا۔

حید کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ آخر یہ رائفل کہاں سے ٹپک پڑی۔
رائفل کوئی باشت بھر کی چیز تو نہیں ہوتی کہ فریدی نے اسے اپنے گھیر دار خاکی شلوار کے
بین میں اس لیا ہو۔

”نہیں سر جارج میں قطعی صحیح الدماغ ہوں۔“ فریدی نے کہا اور اپنے بانس کے موٹے
لے کوچ سے پھاڑ دیا۔ رائفل کی ایک پتلی سی نال ڈنڈے کے اندر سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔
حید نے قہقہہ لگایا۔ جولیا اور سر جارج حیرت سے فریدی کی صورت دیکھ رہے تھے۔
اب فریدی نے تمباکو کا بنڈل کھولنا شروع کیا۔ اس میں سے رائفل کا کندہ اور بے شمار
نوسوں کا پیکٹ برآمد ہوا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے رائفل فٹ کر لی۔

”یہ دیکھو سر جارج..... یہ ایک انتہائی طاقتور اور بے آواز رائفل ہے۔ اس سے میں ایک
ہا کا بھیجا آسانی سے پھاڑ سکتا ہوں۔“ فریدی نے رائفل جارج کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔
”آدمی ہو یا بھوت۔“ جارج ہنس کر بولا۔ ”میں نے تم جیسا دلیر اور عقل مند آدمی آج
نہیں دیکھا۔“

گرفتار ہونے کے بعد پہلی بار سر جارج کے ہونٹوں پر ہنسی آئی تھی۔
”کیا تم کچھ عجیبی ہو جس نے اپنے نشانہ سے آرتھر کا پستول اڑا دیا تھا؟“ جولیا بے ساختہ بولی۔
”جی ہاں..... یہ وہی ہے۔“ حید نے بے دلی سے کہا۔ ”آخر مجھ سے بھی تو کچھ پوچھو۔“
اس نے اس طرح کہا کہ جولیا بے ساختہ ہنس پڑی۔
”اچھا تم ہی بتاؤ۔“

”میں سر جنٹ حید ہوں..... اور.....!“
”سر جنٹ.....!“ جارج چونک کر بولا۔ ”کیا مطلب.....؟“
”یعنی کہ میں اس نالائق آدمی کا لائق اسٹنٹ ہوں۔“ حید نے فریدی کی طرف اشارہ
رکے کہا۔

”صاف صاف بتاؤ آخر مجھے پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔“ جارج نے زچ ہو کر کہا۔
”تو سنو مسٹر جارج..... یہ وہ آدمی ہے جسے تمہارے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جاسوس چیف

”ایک مشرقی آدمی۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”تو کیا تم انہیں لوگوں میں سے ہو جو ایک عرصے سے اس موثری کو حاصل کرنے کی کوشش
کر رہے تھے۔“

”نہیں.....! آخر تم پریشان کیوں ہو گئے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں تمہارا دشمن نہیں
ہوں۔ مجھے تو اب آرتھر سے سمجھنا ہے۔“

”تو کیا ہم اس جزیرے سے زندہ واپس جا سکیں گے۔“ جولیا نے یاس آمیز لہجے میں کہا۔
”خدا کی ذات سے تو یہی امید ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”مس جولیا..... اس کی باتوں میں نہ آنا۔ دنیا میں اس سے بڑا مکار ملنا مشکل ہے۔“
حید بے ساختہ بولا۔

”ارے.....!“ جولیا اچھل کر بولی۔ ”اب اس گونگے نے بھی انگریزی بولنی شروع
کر دی۔“

”ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟“ حید بولا۔

”جولیا اب ہمیں کچھ مرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔“ جارج نے کہا۔
”تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو سر جارج۔“ فریدی بولا۔ ”میری صرف آرتھر سے دشمنی ہے۔

اس نے میرے سب سے خوبصورت کتے کو اپنے لیسٹین سے مروا ڈالا تھا۔“
”ارے تو تم وہی ہو۔“ جولیا ایک بار پھر اچھل پڑی۔ ”مگر نہیں۔ جھوٹ کہتے ہو۔ وہ ایک

مہذب آدمی تھا، جوان اور خوبصورت۔“

”میں وہی ہوں، ابھی تھوڑی دیر میں تم مجھے پہچان لو گی۔“

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ جارج بولا۔ ”اگر تم واقعی میرے دوست ہو تو اس درندے سے
جان بچانے کی کوئی تدبیر کرو۔“

”میں اسے اپنی رائفل کا نشانہ بنانے کی کوشش کروں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”رائفل.....!“ جارج متحیر ہو کر بولا۔ ”اب تمہارے پاس کون سی رائفل ہے۔ شاید
موت کے خوف سے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

بدولٹہ بدولٹہ دور ہی ہوتی گئی پھر سکوت چھا گیا۔
 ”ہاں تو پھر جارج وہ مورتی۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ مورتی میرے خاندان کے ایک بزرگ سرہنری کی ملکیت تھی۔ اب سے تین سو برس
 پہلے وہ اس جنگل میں اسی قوم کے چکر میں پھنس گئے تھے اور ملکہ وقت کے ساتھ ان کی شادی
 ہی کر دی گئی تھی۔ تقریباً چھ ماہ تک سرہنری یہاں ملکہ کے ساتھ رہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ
 ملکہ انہیں کی اولاد میں سے ہے۔“

”تو تم سرہنری کے خاندان سے واقف ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.....!“ سر جارج بولا۔ ”وہ اس مورتی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انہیں کی
 زندگی میں اس کی کافی شہرت ہو گئی تھی اور انہیں کی زندگی میں ایک بار چرائی بھی گئی تھی۔ متعدد بار
 میرے قبضے سے بھی نکل چکی ہے۔ کئی بار لوگوں نے اس کا معہ حل کرنے کی کوشش کی لیکن
 کام رہے۔ خود میں بھی برسوں اسے حل کرنے میں پریشان رہا اور آخر مجھے سرہنری کی ایک تحریر
 سے مدد ملی۔“

”ٹھہریئے.....!“ فریدی بولا۔ ”اب مجھے کہنے دیجئے..... دیکھئے میں جس نتیجے پر پہنچا
 ہاں وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“ سر جارج مسکرا کر بولا۔

”سینگ.....!“ فریدی نے کہا۔ ”صرف سینگ..... اس بت کے ماتھے پر نکلے ہوئے
 بگ کو توڑنا ہے، لیکن مجھے کسی خزانے کی توقع نہیں ہے۔“

”تمہیں اس کا پتہ کیسے لگا۔“ سر جارج نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہایت آسانی سے..... یہ کوئی ایسی مشکل چیز نہ تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”مورتی کے مختلف حصوں پر کچھ حروف کندہ تھے، جو بظاہر ان کے اعضاء کے ناموں کے
 بلکہ حروف معلوم ہوتے تھے، لیکن ان حروف کے کندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ ایک
 ہی کی مورتی یا تصویر کے اعضاء کے نام بتا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے اور کیا
 کہا جاسکتا ہے کہ حروف کندہ کرنے کا مقصد کچھ اور تھا لہذا میں نے ان حروف کو ترتیب دی کر

انپکٹر براؤن اپنا استاد مانتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تمہارے ملک کے بین الاقوامی بلیک
 لیونارڈ کو چنگی بجاتے پکڑ لیا تھا..... کیا سمجھے۔“
 ”اوہ..... تو یہ..... وہ فراڈی ہے۔“

”فراڈی نہیں..... فریدی۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔

”ہاں..... ہاں..... فریدی۔“ سر جارج شش کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ اور پھر فریدی کا ہاتھ
 دبا کر کہنے لگا۔ ”مسٹر فریدی مجھے خوشی ہے کہ تم سے ان حالات میں ملاقات ہوئی..... سنو جارج
 ایشیا کا سب سے بڑا کم سن جاسوس انپکٹر فریدی ہے۔ لیکن تم میرے ساتھ آئے کیوں۔“

”مورتی کا راز معلوم کرنے کے لئے۔ میں نے اپنے دوست انپکٹر براؤن سے اس کے
 متعلق سنا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن افسوس کہ ان کم بختوں نے مورتی مجھ سے چھین لی۔“ سر جارج نے غم آلود
 میں کہا۔

”پرواہ نہ کرو۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں نے اسی رات کو مورتی کا معہ حل کر لیا تھا۔
 آرتھر نے اسے چرایا تھا۔“

”یعنی.....!“ سر جارج نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ یہ مورتی تمہیں کہاں ملی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

سر جارج کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک بہت ہی خوفناک چیخ سنائی دی۔ جو لیا سہم کر جارج
 سے لپٹ گئی۔

”یہ وہی درندہ معلوم ہوتا ہے۔“ سر جارج آہستہ سے بولا۔

”ہم لوگوں کی بو پا کر آ رہا ہے۔“ فریدی نے کہا اور راتفل کی میگزین میں کارٹوس ڈال

لگا۔ وہ غار کے دہانے پر آ کر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سناٹا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب
 طرف جھک رہا تھا۔ شام کی زرد شعاعیں ہرے بھرے درختوں کی چوٹیوں پر لرز رہی تھیں۔
 لوگ بھی غار کے دہانے پر آ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہی چیخ پھر سنائی دی۔ لیکن اس بار آواز کہیں دور سے آئی تھی اور اس

ایک بامعنی لفظ ہارن (سینگ) بنایا۔ ان حروف سے اس کے علاوہ اور بامعنی لفظ بنتا ہی نہیں۔
 ”تم ٹھیک سمجھ..... خدا کی قسم بالکل ٹھیک سمجھ۔“ سر جارج نے چیخ کر کہا۔ ”لیکن تم نے یہ کیسے کہا کہ خزانہ کی توقع نہیں۔“

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتاً جولیا چیخ پڑی۔ فریدی چونکا۔ ایک سیاہ رنگ کا چھٹ اوٹا ہوا مانس ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ فریدی نے سر جارج وغیرہ کو غار کے اندر دھکیل دیا اور خود رانفل سیدھی کر کے نشانہ لینے لگا۔ رانفل چلی بن مانس کے داہنے شانے پر سے بال اڑ گئے، اس نے لڑکھڑا کر ایک خوفناک چیخ ماری پھر فریدی کی طرف چھٹا۔

فریدی نے پھر فائر کیا اس بار گولی ٹھیک اس کی پیشانی پر پڑی تھی۔ وہ گر پڑا۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کھڑا نہ ہوسکا۔ وہ بیٹھ کر مٹی اڑانے لگا۔ اس کی چیخیں بہت زیادہ خوفناک ہوتی جا رہی تھیں۔ فریدی نے پے در پے دو تین فائر کئے اور وہ باآخر ڈھیر ہو گیا۔

عجیب خانہ

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد جولیا کو ہوش آیا اور پھر وہ سب مردہ بن مانس کے گرد اکتھ ہو گئے۔

”میں نے آج تک اتنا خوفناک گوریا نہیں دیکھا۔“ سر جارج نے کہا۔

”اور اتنا احمق شکاری بھی تم نے نہ دیکھا تھا۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”جو خواہ مخواہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتا ہے۔“

”ہم تم لوگوں کے احسان مند ہیں۔“ جولیا بولی۔

”اب ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہئے۔“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

بنا اس کی آنکھیں جھجکا اٹھیں۔ حمید سمجھ گیا کہ اسے کوئی معقول تدبیر سوچ گئی۔
 ”آج رات کو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”یعنی.....!“ حمید نے پوچھا۔

”بتاؤں.....!“ فریدی نے کہا اور بن مانس کی لاش کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے چلا۔
 ”کیا میں بھی آؤں۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”نہیں.....!“

تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد فریدی واپس آیا۔ وہ بن مانس کی لاش کو کہیں دور پھینک آیا تھا۔
 ”دریا کے اس پار میں نے کچھ کشتیاں دیکھی ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آج رات کو ان میں سے ایک کسی طرح اس کنارے پر لانی ہے۔“
 ”یہ ایک خطرناک کام ہے۔“ حمید بولا۔ ”اول تو اس کنارے تک پہنچنا ہی مشکل ہے اور اڑکی طرح پہنچ بھی گئے تو واپسی ناممکن ہے کیونکہ وہاں باقاعدہ پہرہ ہے۔“

”میں دیکھ آیا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہاں صرف تین آدمی ہیں اور پھر میری یہ بے آواز رانفل کس دن کام آئے گی۔“

”تو کیا تم تیر کر اس کنارے تک جاؤ گے۔“ جولیا نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”نہیں، یہ خطرناک کام ہے۔ معلوم نہیں دریا کتنا دور ہو اور پھر خوفناک جنگلی جانوروں کا خطرہ۔“
 ”کیا پھر اس جزیرے میں سسک سسک کر جان دینے کا ارادہ ہے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”مس جولیا..... یہ خاکی جانور کسی کی بات نہیں سنتا۔ بہتر یہی ہے جو کچھ یہ کرے کرنے۔“
 ”حمید نے ہنس کر کہا۔

تار کی پھیل گئی تھی۔ حمید اور جارج نے خشک لکڑیاں اکٹھا کر لیں اور غار میں آگ جلا دی گئی۔ فریدی دو تین مرغائیاں شکار کر لایا تھا، جنہیں جولیا ادھیڑ رہی تھی۔ اس دوران میں فریدی نائب رہا۔ صرف ایک بار کھانا کھانے کے لئے آیا اور پھر چلا گیا۔ آہستہ آہستہ رات گذرتی جا رہی تھی۔ جولیا سر جارج اور حمید غار میں بیٹھے جاگ رہے تھے۔ فریدی کے نہ ہونے کی وجہ

سے کسی کو نیند نہیں آئی۔ جارج بار بار جلتی ہوئی لکڑیوں کی روشنی میں گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
تین بج گئے لیکن فریدی کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ساڑھ تین بجے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

”کام ہو گیا۔“ فریدی نے غار میں گھستے ہوئے کہا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

”کشی لے آئے۔“ جولیا نے پوچھا۔

”ہاں.....!“ فریدی نے آگ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں

آئی۔ اس وقت صرف ایک آدمی کشتی کی نگہبانی کر رہا تھا جسے میں نے رائفل کا کندہ مار کر بے
ہوش کر دیا اور کشتی لے آئی۔“

”ادھ..... تم نے اسے مار کیوں نہیں ڈالا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ضرور شور مچائے گا۔“

”میں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کا عادی نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ صبح

تک ہوش میں نہیں آ سکتا اور اگر آ بھی گیا تو کیا ہوگا..... اب وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”بھلا تمہاری ایک رائفل کسے کے سنبھال سکے گی۔“ جارج نے کہا۔

”اب شاید رائفل چلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔“ فریدی بولا۔

”وہ کیسے.....؟“ جولیا بولی۔

”بس دیکھتی جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”ہم سورج نکلنے

ہی پار پہنچ جائیں گے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تمہارا دماغ خراب ہو چلا ہے۔“

”مجھ پر اعتماد کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہم روز روشن میں ان کے

درمیان پہنچیں گے۔“

”آخر آپ کی اسکیم کیا ہے۔“ حمید نے بے تابی سے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ میں پہلے سے اپنی اسکیم نہیں بتاتا۔“

”ارے اس موت کے جزیرے میں تو اپنے اصول سے ہٹ جائیے۔“ حمید نے کہا۔

”شاید موت کے جزروں میں بھی ایسا نہ کر سکوں۔“

فریدی نے اپنے کپڑے سکھائے اور پھر باہر نکل گیا۔ وہ ان سے کہہ گیا کہ سورج نکلنے سے
پہلے ہی ان کے پاس پہنچ جائے گا۔

فریدی کے چلے جانے کے بعد حمید جولیا اور جارج کو فریدی کے کارناموں کی داستانیں

باتا رہا۔ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ فریدی نے آج تک کوئی غلط قدم اٹھایا ہی نہیں

وردہ اتنا خوش قسمت ہے کہ بعض اوقات اس کی حماقتیں بھی اس کی کامیابی کی وجہ بن گئیں۔ حمید

نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اسے محض سراغ رسانی کا شوق اس محکمے میں لایا ہے، ورنہ وہ خود ایک کافی

مدار آدمی ہے۔

”اس کی بیوی اس کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوگی۔“ جولیا بولی۔

”میرے شیر نے یہ روگ ہی نہیں پالا۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”محض اسی لئے کہ وہ اسے گھریلو آدمی بنانے کی کوشش کرے گی۔“ حمید نے کہا۔

تاریکی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان میں ندائے ستارے چھپکیاں سی لیتے

تلوم ہو رہے تھے۔ ہر طرف ایک پراسرار روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا سناٹا تھا۔ دور

لے چلے ہوئے جنگل بے کراں آسمان کی وسعتوں سے سرگوشیاں کرتے معلوم ہو رہے تھے۔

دفعتاً ایک خوفناک بن مانس خاموشی سے غار میں داخل ہوا۔ حمید کی پشت غار کے دہانے

پر طرف تھی۔ جولیا اور جارج اوٹکھنے لگے تھے۔ بن مانس کے داخل ہونے کی کسی کو خبر تک نہ

ہوئی۔ اس نے حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حمید چونک کر مڑا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ

بھاگ کر جارج پر گر پڑا۔ جولیا اور جارج جاگ پڑے۔ دونوں کی گھگھکی بندھ گئی۔ دفعتاً بن مانس

ایکوں کی طرح قہقہہ مار کر ہنسا۔

”ڈر نہیں..... میں فریدی ہوں۔“ بن مانس نے کہا۔ ”میں نے اس بن مانس کی کھال

ہار کر اپنے جسم پر فٹ کر لی ہے، حمید تم دیکھ کر بتاؤ کہیں سے کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔“

تینوں ہنسنے لگے، لیکن ان کی ہنسی میں اب تک خوف شامل تھا۔ حمید ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا

لینے سے اوپر تک فریدی کا جائزہ لینے لگا۔

”سو فیصدی خالص بن مانس۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”لیکن اس حماقت کی ضرورت؟“

”تمہیں پھر سے مہذب دنیا کی روشنی دکھانے کے لئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اب میں سبلی قوم کا ایک زندہ دیوتا ہوں اور تم لوگ میری پناہ میں ہو۔ کیا وہ اب ہمیں اپنی سر زمین میں داخل ہونے دیں گے، مگر اس کھال کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ سورج نکلے ہی والا ہے۔ جلدی کرو، کشتی کنارے پر تیار ہے اور ہاں اب یہ بھی سن لو۔ اب میں اس وقت تک خاموشی اختیار کر لوں گا جب تک ہم اس سر زمین سے نکل نہ جائیں۔ جارج تم اس بات کا خیال رکھنا کہ آرتھر اور اس کی سفید ملکہ یہاں سے نکل کر کسی طرف جانے نہ پائیں۔ ہم انہیں واپس لے چلیں گے۔“

چاروں جا کر کشتی پر بیٹھ گئے۔ حمید کشتی کھینے لگا۔ سر جارج رائفل لئے بیٹھا تھا۔ دوسرے کنارے پر کوئی نہیں تھا۔ صرف دو تین کشتیاں کھڑی تھیں۔ وہ بآسانی پار اتر گئے۔

بن مانس جولیا کا ہاتھ پکڑے تھا۔ حمید اور جارج ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ بن مانس کو دیکھ کر جنگلیوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ جب وہ لوگ بستی میں آئے تو عورتیں اور بچے ڈر ڈر کر اپنے جھوپڑوں میں گھس گئے۔ ہر طرف شور برپا تھا۔ لوگ بستی چھوڑ چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بہترے عبادت گاہوں میں گر کر چینیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پھر یہ لوگ اس احاطے میں پہنچے جہاں انہوں نے ملکہ اور آرتھر کو دیکھا تھا اور جہاں بڑے بڑے بت نصب تھے، جیسے ہی ان لوگوں نے بن مانس کو دیکھا بھگدڑ مچ گئی۔ وہاں بھی بہترے سجدے میں گر گئے تھے۔ فریدی بن مانسوں کی طرح شور مچاتا ہوا اچھل کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ آرتھر نے بھاگنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے میں سر جارج کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل کی نال اس کے سینے پر تھی۔ ملکہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ فریدی نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس احاطے میں ان کے علاوہ ایک متنفس بھی باقی نہ تھا۔ حمید نے آرتھر کے ہاتھ پیر رکھے۔ جکڑ کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ بھاگتے ہوئے جنگلیوں کا شور کہیں دور سنائی دے رہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے جھوپڑے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ شاید ان کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ ان کے دیوتا بن مانس نے ان کی بستی میں آ کر انہیں درشن دیا تھا۔

سر جارج سی جی لادیوتا کی سینک توڑنے میں مشغول ہو گیا۔ حمید اور جولیا کھانے پینے کا سامان اکٹھا کرنے لگے۔ بے ہوش ملکہ ابھی تک فریدی کے کاںڈھے پر پڑی تھی۔

چند گھنٹوں کے بعد وہ ایک بڑی کشتی میں بیٹھے دریائے نامتی پار کر رہے تھے۔ فریدی نے بد کو راستے کے متعلق پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ وہ دریائے نامتی پار کر کے جارج والے نقشے کے مطابق سفر کرنے کے بجائے دریائے نامتی کی شاخ ستیل ندی سے گذرتا ہوا آبی سفر جاری رکھنا اپنا تھا۔ اس طرح وہ کشتی پر بیٹھے ہی بیٹھے رام گڑھ کے قریب پہنچ سکتے تھے۔ جارج والا نقشہ بے تین سو برس پرانا تھا جسے سر ہنری نے ترتیب دیا تھا، اور فریدی نے یہ اقدام اپنی نرانی معلومات کی بناء پر کیا تھا، اس طرح سفر جاری رکھنے کی ایک وجہ اور یہ بھی تھی کہ انہیں باری کے لئے اور کوئی دوسری چیز مل بھی نہیں سکتی۔ نچروں کو آرتھر کے درغلایے ہوئے دروں سمیت وہ پہلے ہی بھگا چکا تھا۔

حمید اور سر جارج کشتی کھے رہے تھے، آرتھر بندھا ہوا پڑا تھا۔ ملکہ ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ ہوش اور سبھی ہوئی ایک طرف بیٹھی تھی۔ فریدی اب تک بن مانس کی کھال پہنے ہوئے تھا۔ خوف تھا کہ سبلی قوم کے لوگ حملہ نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کھال رات تک پہنے رہے جب تک کہ اس علاقے میں سے گزر نہ جائے۔ گرمی اور کھال کی بدبو کی بد سے اس کا سر چکرانے لگا۔

”خزانے کا کیا ہوا سر جارج۔“ آرتھر نے پڑے پڑے پوچھا۔ ”اور اس وحشی جانور کو تم نے کس طرح قابو میں کیا۔“

”وحشی جانور کی ایک لمبی داستان ہے۔ وہ پھر کبھی سناؤں گا۔“ سر جارج پھکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”لیکن خزانہ..... خزانے پر تم پہلے ہی قبضہ پا چکے ہو اور اس کے تنہا مالک ہو۔“

”کیا مطلب.....؟“ آرتھر چونک کر بولا۔ ”میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ مجھے خزانہ نہیں مل سکا۔“

”تم جھوٹے ہو۔“ جارج ہنس کر بولا۔ ”وہ خزانہ اس وقت بھی تمہارے پاس ہے اور تم

اس کے تنہا مالک ہو۔“

”اوہ..... سر جارج میں جانتا ہوں کہ تم دھوکہ دہی کے سلسلے میں مجھے قانون کے حوالے کر دو گے۔ لیکن مجھے اس طرح زچ مت کرو، میں سب کچھ بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ خزانہ تمہیں مبارک رہے۔ تم جیتے میں ہار گیا۔ لیکن میری درخواست ہے کہ میرا مضحکہ مت اڑاؤ۔“

”آرتھر مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ سر جارج نے کہا۔ ”تم نے مجھے دھوکا ضرور دیا تھا لیکن میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ محض اس لئے کہ اب تم اس خزانہ پر قابض ہو چکے ہو اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں معاف نہ کرتا۔“

”سر جارج مجھے پریشان نہ کرو۔“ آرتھر نے ایک بچے کی طرح بے بسی سے کہا۔

”بجدا میں تمہیں پریشان نہیں کر رہا ہوں۔“ جارج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو میں تمہارے ہاتھ پیر بھی کھولے دیتا ہوں۔“

جارج نے بن مانس کی طرف دیکھا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی سر جارج نے آرتھر کے ہاتھ پیر کھول دیئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حیرت کی وجہ سے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ البتہ ملکہ کے چہرے پر بشارت دوڑ گئی۔

”تو کیا اب یہ لوگ ہمیں قتل نہ کریں گے۔“ ملکہ نے لاطینی زبان میں آرتھر سے پوچھا۔

”نہیں.....!“ آرتھر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

پھر وہ جارج کی طرف مخاطب ہوا اور حمید کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اس کو گنگے کا ساتھی کہاں گیا.....؟“

”اسے بن مانس نے مار ڈالا۔“ سر جارج نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ آرتھر بولا۔ ”وہ ایک بہادر اور وفادار آدمی تھا اور میں اس کے مقابلہ

میں ایک ذلیل آدمی ہوں۔“

”تم اس خزانے کے لئے بے تاب ہو۔“ سر جارج نے کہا۔ ”لو یہ رہا خزانہ۔ یہ سی ٹی

لادیوٹا کی سینک کے اندر سے نکلا ہے۔“

سر جارج نے ایک بہت پرانا تہہ کیا ہوا کاغذ آرتھر کی طرف بڑھایا۔ آرتھر اسے لے کر

آواز میں پڑھنے لگا۔

”تم خزانے کی تلاش میں آئے ہو۔ خوش آمدید! میں سچ مچ ایک بہت بڑا خزانہ تمہیں

سونپ رہا ہوں۔ کیا تمہارے لئے یہ خزانہ کم ہے کہ تم ایک سفید فام عورت یا اس کے بچوں کو وحشی

رندوں کے بچوں سے آزاد کرا کے اپنے ساتھ لئے جا رہے ہو۔ کیا یہ کم ہے کہ تمہارے اس

کارنامے پر تمہاری آنے والی تسلیں فخر کر سکیں گی۔ میں سر ہنری فیلے اپنی سفید فام بیوی (جو ان

دشمنوں کی ملکہ ہے) کے کٹن میں اپنی یادگار چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں جا رہا ہوں ورنہ میں بھی

ان کی درندگ کا شکار ہو جاؤں گا۔ اپنے ملک میں پہنچ کر اس بات کی کوشش کروں گا کہ اپنے

ساتھ یہاں تک ایک مہم لے آؤں اور اپنی بیوی کو یہاں سے لے جاؤں، لیکن مجھے اس کی امید

نہیں۔ میری قوم صرف ایک عورت کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول نہ لے گی۔ خیر میں انتہائی کوشش

کروں گا۔ اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو میں اپنی لالچی قوم کو دوسری طرح راضی کروں گا۔

میں سی جی لادیوٹا کی ایک پیتل کی مورتی بنا کر اسے انتہائی پر اسرار طریقے پر شہرت دوں گا۔ ان

دلوں میرے ملک میں ایسے لوگوں کی کی نہیں جو خزانوں کی تلاش میں مشرق کا سفر کرتے ہیں۔

دولت کے لالچ میں اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ میں انہیں اسی طرح کچتا رہے جنگوں

میں بھیجوں گا۔ کاش یہ میرا مشن کامیاب ہو سکے۔ بہت ممکن ہے کہ میری اولاد ہی میں سے کوئی

اس کی کوشش کرے۔ بہر حال میں خدا اور اس کے بیٹے کی رحمتوں کا منتظر ہوں۔ اگر میں اس مشن

میں کامیابی سے پہلے مر بھی گیا تو اس وقت تک میری روح بے قرار رہے گی جب تک میرے

سفید فام بچے اپنے مہذب ملک میں نہ پہنچ جائیں۔ تم پر خدا اور اسکے بیٹے کی برکتیں نازل ہوں۔

سر ہنری فیلے

یکم اپریل ۱۷۱۳ء

آرتھر نے قہقہہ لگایا اور وہ پرچہ واپس کر دیا۔ حمید اور جولیا حیرت سے ایک دوسرے کا منہ

نکد رہے تھے۔

”کیا بات ہے۔“ ملکہ نے آرتھر سے پوچھا۔

”ہم لوگ خزانے کی تلاش میں آئے تھے۔“ آرتھر نے کہا۔ ”اور میں نے وہ خزانہ پالیا

نے اٹھتے ہوئے کہا۔

حیدر ہٹ گیا، اس کی جگہ بن مانس کشتی کھینے لگا۔

”مسٹر فریدی..... اب آرتھر کو زیادہ پریشان نہ کرو۔“ جولیا بولی۔

”مجھے بھی بہت گری لگ رہی ہے۔“ فریدی نے کہا اور پتوارکھ کر اپنی کھال اتارنے لگا۔

آرتھر کے منہ سے حیرت کی چیخ نکل گئی۔ فریدی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو گیا تھا۔ اس نے پہاڑی مزدور والا میک اپ بھی بگاڑ دیا تھا۔

”تم یہاں کہاں۔“ آرتھر چیخ کر بولا۔ ”تم وہی ہو جس نے میرے دو عمدہ قسم کے کتوں کا خون کر دیا تھا۔“

”ہاں میں وہی ہوں۔“ فریدی نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

جولیا نے سارا واقعہ آرتھر کو بتایا۔

”مسٹر فریدی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ آرتھر نے فریدی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اسی وقت تم پر شبہ ہو گیا تھا جب تم نے افریقہ کے حوالے دینے شروع کر دیے تھے۔ لیکن تم نے بہت خوبصورتی سے مجھے یقین دلادیا تھا۔“

”کیوں سر جارج.....!“ فریدی نے کہا۔ ”کیسا خزانہ ملا۔ تمہاری زبانی سرہنری کی داستان نئے ہی میں شے میں پڑ گیا تھا۔ محض اس لئے کہ اگر واقعی وہ کسی ایسے خزانے سے واقف تھا تو اس نے خود ہی اسے شہرت کیوں دی۔ وہ اس صورتی کو دکھا دکھا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”ہاں تم نے پہلے ہی خزانے کی طرف سے ناامیدی ظاہر کر دی تھی۔“ سر جارج نے کہا۔ ان تیزی سے پیش آنے والے واقعات کو ملکہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس کے غلط آرتھر سے پوچھا۔ آرتھر نے شروع سے آخر تک ساری داستان سنا دی۔

”کاش میں اپنی قوم کے لوگوں کو یہاں سے بچا سکتی۔“ ملکہ قہر آلود آواز میں بولی۔ اس کا رقصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ فریدی کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے موقع ملتے ہی اسے قتل کر دے۔ پھر اس نے دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ فریدی نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔

”آرتھر بہتر یہی ہے کہ اسے باندھ کر ایک طرف ڈال دو، ورنہ یہ خودکشی کرے گی۔“

اور اس کا تنہا مالک ہوں۔“ اور پھر آرتھر نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ اس کے چہرے سے بہر حال یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اپنی حکومت چھوڑنے کا غم ہے۔

دن گزرتا جا رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ وہ کچھار کے علاقے سے نکل کر ستیل ندی کے دہانے میں داخل ہو رہے تھے۔ فریدی بدستور خاموش بیٹھا تھا۔ ملکہ کبھی کبھی خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ آرتھر بھی مطمئن نہیں تھا۔

”لیکن ان لوگوں پر ہمارا دیوتا میمون اعظم کیسے مہربان ہو گیا۔“ ملکہ نے طویل خاموشی کے بعد آرتھر سے لاطینی زبان میں کہا۔

”اے ملکہ میں نے مناسب سمجھا کہ تجھے تیری نسل کے دو آدمیوں میں بھجوا دوں۔“ بن مانس لاطینی زبان میں بولا۔ آرتھر اچھل پڑا اور ملکہ..... بعدے میں گر گئی۔

”ارے ملکہ بعدے سے اٹھ۔ تو خوش قسمت ہے کہ اس وقت تیری نسل کے لوگ تیرے پاس موجود ہیں۔ یہ بوڑھا تیرا عزیز ہے اور یہ لڑکی شاید رشتے میں تیری بہن لگتی ہے۔ اٹھ اور ان دونوں کو بوسہ دے۔“ میمون اعظم نے گرج کر کہا۔

ملکہ نے اٹھ کر سر جارج اور جولیا کی پیشانیاں چوم لیں..... انہوں نے بھی اسے بوسہ دیا۔ ”اور بیٹا آرتھر.....!“ بن مانس انگریزی میں بولا۔ ”آج سے عہد کر لو کہ کبھی اپنے ساتھیوں کو دھوکہ نہ دو گے۔“

”ارے سر جارج یہ تو انگریزی بھی جانتا ہے۔“ آرتھر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں دیوتا ہوں..... آرتھر۔“ بن مانس نے حیدر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”میں حکم دوں تو یہ گونگا بھی انگریزی بولنے لگے۔ ہاں گونگے آرتھر سے انگریزی میں بات کر۔“

”کیپٹن آرتھر..... دیوتا ج کہتا ہے۔“ حیدر نے مسکرا کر انگریزی میں کہا۔ آرتھر بوکھلا گیا۔ ”جارج یہ کیا معاملہ ہے۔“ آرتھر نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

”میں کیا جانوں۔“ جارج اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب ذرا تم پتوار پکڑ لو۔“ آرتھر خاموشی سی پتوار کھینے لگا۔

”اچھا اے گونگے اب تو بھی اٹھ تیری جگہ میں بیٹھوں گا۔ تو بھی تھک گیا ہوگا۔“ بن مانس

صدیوں کا جنگلی پن آسانی سے نہیں جائے گا۔ اسے مہذب بنانے کے لئے تمہیں سالہا سال محنت کرنی پڑے گی۔“

”میں اس کے لئے سب کچھ کروں گا مسٹر فریدی۔ میں اسے بے حد چاہتا ہوں۔ اس کے جنگلی پن میں بھی ایک اتھاہ محبت کی دولت ملی ہے۔“ آرتھر نے کہا اور ملکہ کے ہاتھ پیر باندھ کر اُسے ایک طرف ڈال دیا۔ وہ رو رو کر آرتھر سے منت کر رہی تھی کہ اسے مر جانے دیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاموش ہو گئی۔

”فریدی تم کبھی انگلینڈ بھی آؤ گے؟“ جولیا نے کہا۔

”میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ جارج نے کہا۔

”آؤں گا۔“ فریدی نے کہا اور خاموشی سے کشتی کھیتا رہا۔

”تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔“ حمید نے جولیا سے کہا۔

”تم بھی آنا۔“ جولیا ہنس کر بولی۔

”نہیں ابھی میرا باپ زندہ ہے۔ وہ مجھے کبھی انگلینڈ نہ جانے دے گا۔“ حمید نے ایسی مسکیت سے کہا کہ سب ہنس پڑے۔

رات کے بے کراں سنائے میں چوہوں کی ”شپاشپ“ ایک عجیب سا نغمہ چھیڑے ہوئے تھی۔ سر پر تاروں بھرا لامحدود آسمان..... آسمان صدیوں پرانی کہانی دہرا رہا تھا..... اور نیچے لہروں کی ”زلزل رل رل“ ایک غیر فانی گیت گارہی تھی۔

فریدی ماضی کے دھندلکوں میں ڈوب گیا۔

ختم شد